فہرست

جاوید احمد غامدی

مرتب: منظور الحسن

جمعے کی امامت

[''آج'' ٹی وی کے پروگرام ''Live with Ghamidi'' میں میزبان
ڈاکٹر منیر احمد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں جناب جاوید احمد غامدی کی گفتگو]

جمعے کی امامت کے بارے میں شریعت کی کیا ہدایات ہیں اور ہم ان پر کس حد تک عمل پیرا ہیں؟ اس مسئلے کے بارے میں پہلے یہ جان لیجیے کہ اسلام میں نماز کی عبادت کا جو قانون بیان کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں: ایک حصہ فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی پنج وقتہ نمازوں پر مشتمل ہے اور دوسرا جمعے کی نماز پر مبنی ہے۔ پنج وقتہ نمازیں انفرادی طور پر بھی ادا کی جا سکتی ہیں اور جماعت کے ساتھ بھی۔ انھیں جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے لیے کسی بھی مناسب جگہ پر مسجد بنائی جا سکتی ہے۔ گھر کے کسی گوشے میں بھی بنائی جا سکتی ہے، محلے میں بھی بنائی جا سکتی ہے اور کام کاج کی جگہ پر بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی خاص مقام کی پابندی نہیں ہے۔ ان نمازوں میں امام کے لیے بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ ہر مسلمان ان کی امامت کر سکتا ہے۔

جہاں تک جمعے کی نماز کا تعلق ہے تو اس کا قانون پنج وقتہ نماز سے کچھ مختلف ہے۔ اس کی رو سے مسلمانوں کے نظم اجتماعی، یعنی حکومت و ریاست کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ہفتے میں ایک دن جمعے کے روز خصوصی نماز کا اہتمام کریں۔ اس دن ظہر کی نماز ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے۔ اس نماز کے بارے میں یہ ہدایت ہے کہ اسے عام مسجدوں کے بجائے اس نماز کے لیے خاص کی گئی مساجد ہی میں ادا کیا جائے۔ اس نماز کی بنیادی شرط

یہ ہے کہ اس کا اہتمام عام مسلمان نہیں، بلکہ ان کے حکمران کرتے ہیں۔ اس کی امامت اور خطاب کا حق بھی انھی کو حاصل ہے اور اس کی ذمہ داری بھی انھی پر عائد ہوتی ہے۔

نماز جمعہ کے اس قانون کی کیا حکمت ہے؟ اس زاویے سے اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے اس کے ذریعے سے حکمرانوں کو خدا کی یاددہانی اور عوام کی جواب دہی سے بیک وقت متعلق کر دیا ہے۔ وہ اللہ کی عبادت گاہ میں آتے ہیں، اس کے حضور سربہ سجود ہوتے ہیں، اس کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ عمل ظاہر ہے کہ ان کے لیے اپنے پروردگار سے تعلق کی تذکیر اور یاددہانی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے ساتھ انھیں عامۃ الناس کا بھی براہ راست سامنا کرنا پڑتا اور ان کے آگے مسئول ہونا پڑتا ہے۔ یہ ہفتہ وار مسئولیت ان کے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ نہ صرف لوگوں کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اپنے اقدامات کی وضاحت بھی کر پاتے ہیں۔ اس عمل کے نتیجے میں عوام اور حکمرانوں کے مابین ابلاغ، ہم آہنگی اور اعتماد کے رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس بات کا کوئی تصور نہیں تھا کہ لوگ اپنے طور پر محلے میں، گڑھی میں یا گاؤں میں جمعے کا اہتمام کر لیں۔ جمعے کی نماز کے لیے جامع مساجد مقرر تھیں۔ ابتدا میں مسجد نبوی ہی میں جمعے کا اہتمام ہوتا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود امامت فرماتے اور خطبہ دیتے تھے۔ بعد میں جب سلطنت پھیل گئی تو مختلف جگہوں پر آپ کے مقرر کردہ ذمہ دار جمعے کی نماز کا اہتمام کرنے لگے۔ خلفاے راشدین کے زمانے میں بھی یہی طریقہ رائج رہا۔ بنوامیہ کے زمانے تک جمعے کا منبر حکمرانوں ہی کے پاس رہا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ حکمران لوگوں سے خوف زدہ ہونا شروع ہو گئے۔ یعنی وہ جب مسجد میں آتے تو انھیں لوگوں کی تنقید اور ردعمل کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس خوف کی وجہ سے انھوں نے جمعے کے منبر کو چھوڑ دیا۔ جیسے ہی حکمرانوں نے جمعے کا منبر چھوڑا تو علما نے اس کو سنبھال لیا۔ اب تک یہ منبر انھی کے پاس ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جمعے کے منبر کے حکمرانوں کی تحویل سے نکلنے اور علما کی تحویل میں جانے کے نہایت مضر رساں نتائج نکلے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حکمرانوں کے لیے عبادت اور اللہ کے دین کے ساتھ تعلق کا ایک لازمی موقع ختم ہو گیا ہے۔ حکمران اگر جمعے کے لیے مسجدوں میں آتے تو ان کا کچھ وقت عبادت میں گزرتا۔ خطبۂ جمعہ میں وعظ و نصیحت کے لیے انھیں دینی تعلیمات سے رجوع کرنا پڑتا۔ نماز کی امامت میں تلاوت کے لیے قرآن کے اجزا کو یاد کرنا پڑتا۔ ایسی وضع قطع اختیار کرنا پڑتی جو مسجد میں حاضری کے لیے موزوں ہو۔ یہ ساری چیزیں ظاہر ہے کہ

انھیں اللہ اور اس کے دین سے قریب کرنے کا باعث بنتیں۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حکمرانوں کی عوام کے ساتھ رابطے کی ایک نہایت موزوں صورت ختم ہو گئی ہے۔ جمعے کا اجتماع اس کی سادہ اور آسان صورت تھی۔ ہر آدمی ان تک رسائی حاصل کر سکتا تھا اور انھیں اپنی تنقید اور اپنی رائے سے آگاہ کر سکتا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ حکمرانوں پر تنقید اور ان کا احتساب تو دور کی بات ہے، ان تک رسائی کا تصور بھی عام آدمی کے لیے محال ہو گیا ہے۔ تیسرا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسجدیں فرقہ بندی کا مرکز بن گئی ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ ہر مسجد کسی نہ کسی فرقے سے منسوب ہے۔ چنانچہ یہاں پر اہل حدیث کی مسجدیں ہیں، دیوبندیوں کی مسجدیں ہیں اور بریلویوں کی مسجدیں ہیں۔ ان سب فرقوں کی مسجدیں ہیں، لیکن فرقہ بندی سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کی مسجد یا اللہ کی مسجد کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس صورت حال کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جمعے کے اہتمام اور اس کی امامت کے بارے میں اسلامی شریعت کو نافذ کیا جائے اور جمعے کے منبر کو علما سے لے کر واپس حکمرانوں کی تحویل میں دے دیا جائے۔ فرقہ بندی کے خاتمے اور حکمرانوں کی اصلاح کے لیے صحیح راستہ یہی ہے۔ واضح رہے کہ ہمارے ملک میں نوے پچانوے فی صد لوگ حنفی ہیں۔ فقہ حنفی میں جمعے کی شرائط میں یہ بات شامل ہے کہ اس کے اہتمام کے لیے سلطان یعنی حکمران ضروری ہے اور اس کا انعقاد مصر جامعہ میں کیا جائے گا، یعنی ایسی جگہ پر کیا جائے گا جہاں حکمران یا اس کا کوئی نمائندہ موجود ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۲۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

یَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ، فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى
اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً، فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ، ثُمَّ

یہ[۲۲۴] اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ (اِس قرآن کے بجاے) اِن پر براہ راست آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ۔ (اِس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے)۔ اِنھوں نے موسیٰ سے اِس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔ اِنھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں خدا کو سامنے دکھاؤ تو اِن کی اِس سرکشی کے باعث اِن کو

---

[۲۲۴] پہلا سوال کمزور مسلمانوں کی طرف سے تھا اور دوسرا منافقین کی طرف سے۔ اب یہ تیسرا سوال ہے جو اِس سورہ کی دعوت کے جواب میں اہل کتاب کے اِس مطالبے کی صورت میں سامنے آیا ہے کہ اُنھیں قرآن نہیں، بلکہ ایک ایسی کتاب چاہیے جو آسمان سے براہ راست نازل کی جائے۔ وہ اس کے بعد ہی ایمان لانے کے لیے تیار ہوں گے۔ اس کا جواب اس قدر سخت اور شدید تنبیہ کے ساتھ دیا گیا ہے کہ استاذ امام کے الفاظ میں لفظ لفظ سے جوش غضب ابلا پڑ رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”... پوری تقریر ازابتدا تا انتہا صرف فرد قرارداد جرائم پر مشتمل ہے اور کلام کے جوش اور روانی کا یہ عالم ہے کہ بات شروع ہونے کے بعد یہ متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ختم کہاں ہوئی۔ اِس قسم کے پر جوش اور پر غضب کلام میں

اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ، فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ، وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ، وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ

کڑک نے آلیا تھا۔[225] پھر اِنھوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا، اِس کے بعد کہ اِن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی تھیں۔ اِس پر بھی ہم نے اِن سے درگذر کیا اور موسیٰ کو (اِن پر) صریح غلبہ عطا فرمایا تھا۔[226] اور ہم نے طور کو اِن پر اٹھا لیا تھا، اِن سے عہد کے ساتھ[227] اور اِن کو حکم دیا تھا کہ (شہر کے) دروازے میں سر

عموماً خبر حذف ہو جاتی ہے، گویا متکلم کا جوش ہی خبر کا قائم مقام بن جاتا ہے اور مبتدا ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۱۵)

[۲۲۵] اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش اگر شرح صدر اور اطمینان قلب کے لیے ہو تو کوئی قابل ملامت چیز نہیں ہے، لیکن بنی اسرائیل کا یہ مطالبہ محض اُن کی بے یقینی اور تشکیک کا مظاہرہ اور انکار و تکذیب کا بہانہ تھا۔ اُنھیں کسی طرح اِس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرماتے ہیں، لہٰذا اُن پر عتاب ہوا۔ اِس کے لیے اصل میں 'فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن کا مدعا یہ ہے کہ یہ اللہ نے اُن پر کوئی زیادتی نہیں کی، بلکہ اُنھوں نے خود اپنے اوپر زیادتی کی ہے۔ وہ ایک ایسے تجربے کے لیے بہ ضد ہوئے جس کی تاب وہ کسی طرح نہیں لا سکتے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود ہی اُس کی زد میں آ گئے۔

[۲۲۶] اِس کی صورت یہ ہوئی کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے بنی اسرائیل کی جماعت کو مجرموں سے پاک کر دیا گیا اور کسی کو اُن کے سامنے چون و چرا کی جرأت نہیں ہوئی۔ بائیبل کی کتاب خروج میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ''...موسیٰ نے لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا جو جو خداوند کی طرف ہے (یعنی اپنے ایمان پر قائم ہے)، وہ میرے پاس آ جائے۔ تب سب بنی لاوی اُس کے پاس جمع ہو گئے اور اُس نے اُن سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا۔ چنانچہ اُس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو (یعنی اپنے ایمان کی تجدید کرو)، بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہوتا کہ وہ

سُجَّدًا، وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِی السَّبْتِ، وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ﴿۱۵۴﴾
فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ، بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۵۵﴾

جھکائے ہوئے داخل ہوں[۲۲۸] اور اِن سے کہا تھا کہ سبت کے معاملے میں نافرمانی نہ کرنا[۲۲۹] اور (اِن سب چیزوں پر) ہم نے اِن سے پختہ عہد لیا تھا۔۱۵۳-۱۵۴

پھر اِن کے عہد توڑ دینے کی وجہ سے (ہم نے اِن پر لعنت کر دی)، اور اِس وجہ سے کہ اِنھوں نے اللہ کی آیتوں کو نہیں مانا اور اِن کے نبیوں کو ناحق قتل کر دینے کی وجہ سے اور اِس وجہ سے کہ اِنھوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر تو غلاف ہیں ـــــ (نہیں)، بلکہ اِن کے کفر کی پاداش میں اللہ نے اِن کے دلوں

تم کو آج ہی برکت دے۔'' (۳۲:۲۶-۲۹)

[۲۲۷] قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ عہد پہاڑ کے دامن میں اِس طرح لیا گیا کہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ کر سائبان کی طرح اُن کے سروں پر لٹک رہا تھا اور اُنھیں لگتا تھا کہ وہ اُن پر گر کر رہے گا۔ قرآن نے یہاں اِس حالت کو پہاڑ کے اُن پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کے لیے اصل میں 'وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِیْثَاقِهِمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ب' ملابست کے لیے ہے۔ اِس سے جس حقیقت کو مصور کر کے پیش کرنا مقصود ہے، وہ استاذ امام کے الفاظ میں یہ ہے کہ خدا نے اُن کے اوپر طور کو بھی اٹھایا اور اُس کے ساتھ معاہدے کو بھی کہ یہ معاہدہ ہے اور یہ پہاڑ، اگر اِس معاہدے کی بے حرمتی ہوئی تو اِسی پتھر سے تمھارا سر کچل دیا جائے گا۔

[۲۲۸] یہ سرزمین فلسطین ہی کا کوئی شہر تھا جس کی فتح کے بعد اُنھیں عجز اور فروتنی کے ساتھ اُس میں داخل ہونے کی ہدایت کی گئی۔

[۲۲۹] یہ اصلاً جمعہ کا دن تھا جسے بنی اسرائیل نے اُس کے اگلے دن سے بدل ڈالا۔ اُن کے ہاں یہ دن پشت در پشت تک دائمی عہد کے نشان کے طور پر خدا کی عبادت کے لیے خاص تھا اور اِس میں اُن کے لیے کام کاج، سیر و شکار، حتیٰ کہ گھروں میں آگ جلانا اور لونڈی غلاموں سے کوئی خدمت لینا بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اُن کی ایک بستی کے لوگوں نے اِس دن کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے جو شرعی حیلے ایجاد کیے اور اِس طرح اللہ کی شریعت کا

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ، وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ، وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ، مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ، وَمَا

پر مہر کر دی ہے، اِس لیے (اب) یہ کم ہی ایمان لائیں گے ــــــ اور اِن کے کفر کی وجہ سے[۲۳۰] اور مریم پر بہتان عظیم لگانے کی وجہ سے[۲۳۱] اور اِن کے اِس دعوے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح ابن مریم رسول اللہ[۲۳۲] کو قتل کر دیا ہے ــــــ دراں حالیکہ اِنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی،[۲۳۳] بلکہ معاملہ اِن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا۔[۲۳۴] اِس میں جو لوگ اختلاف کر رہے ہیں،[۲۳۵] وہ اِس معاملے میں شک میں پڑے ہوئے

مذاق اڑایا، یہ اُسی کا ذکر ہے۔

[۲۳۰] اِس کا عطف اوپر کے سلسلۂ کلام پر ہے۔ اِس سے پہلے ایک جملۂ معترضہ ہے جس کے بعد اہل کتاب کے جرائم کا بیان ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا ہے۔

[۲۳۱] یہود نے یہ الزام سیدنا مسیح علیہ السلام کے بعد اُن کی ماں پر لگایا۔ اُن کے سامنے وہ اِس کی جرأت کبھی نہیں کر سکے۔

[۲۳۲] 'رسول اللّٰه' کا لفظ اِس آیت میں ہمارے نزدیک یہود کے قول کا جز نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تضمین ہے جس سے اُن کے جرم کی سنگینی کو واضح کرنا مقصود ہے۔

[۲۳۳] یہ پھر ایک جملۂ معترضہ ہے جس میں یہود کی طرف سے مسیح علیہ السلام کے دعویٰ قتل کی فوری تردید کی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... اِس فوری تردید سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے رسول اُس کی حفاظت میں ہوتے ہیں، اُن کے خلاف اُس کے دشمنوں کی چالیں خدا کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اِس وجہ سے یہود کا یہ دعویٰ کہ اُنھوں نے اُن کو قتل کیا یا سولی دی بالکل بے بنیاد ہے۔ وہ اپنی اس شرارت میں بالکل ناکام رہے۔ البتہ ایک جھوٹے دعوے کا بار اپنے سر لے کر ہمیشہ کے لیے مبغوض و ملعون بن گئے۔ دوسرا یہ کہ نہ کہیں مسیح کے قتل کا واقعہ پیش آیا نہ سولی کا، لیکن پال (Paul) کے متبع نصاریٰ نے اِس فرضی افسانے کو لے کر اس پر ایک پوری دیومالا (mythology) تصنیف کر ڈالی اور اِس طرح پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۲۰)

قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾
وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ، وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ

ہیں، اُن کو اِس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمانوں کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اِنھوں نے ہرگز اُس کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ ہی نے اُسے اپنی طرف اٹھا لیا تھا[۲۳۶] اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۱۵۵-۱۵۸

---

[۲۳۴] یعنی صورت حال ایسی بنا دی گئی کہ یہود یہی سمجھے کہ اُنھوں نے مسیح علیہ السلام کو سولی دلوا دی ہے۔ اِس کی صورت کیا ہوئی؟ اِس معاملے میں سب سے زیادہ قرین قیاس بیان انجیل برنباس کا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب یہوداہ اسکریوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر مسیح علیہ السلام کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آں جناب کو اٹھا کر لے گئے اور یہوداہ اسکریوتی کی صورت اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو سیدنا مسیح کی تھی۔ سولی اُسے ہی دی گئی۔ مسیح علیہ السلام کو ہاتھ لگانا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں ہوا۔ قرآن نے غالباً اِسی کو یہاں 'معاملہ اُن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا' سے تعبیر کیا ہے۔

[۲۳۵] اصل میں 'اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے مراد نصاریٰ ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِن کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''... چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ میں نفس واقعہ سے متعلق بھی ... بڑا اختلاف ہے اور اِس پر جو دیومالا (mythology) اُنھوں نے تصنیف کی ہے، اُس میں بھی بڑے اختلافات ہیں اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اِس بات کا کہ اُنھوں نے اپنے سارے علم کلام کی بنیاد حقیقت کے بجائے محض ظن پر رکھی اور اِس طرح جس سولی سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح کو محفوظ رکھا، نصاریٰ نے اُس پر خود چڑھ کر خودکشی کر لی۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۲۱)

[۲۳۶] اصل الفاظ ہیں: 'بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'۔ اِس رفع کی وضاحت قرآن نے سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۵۵ میں اِس طرح فرمائی ہے کہ وفات کے بعد اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنی طرف اٹھا لیں گے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ روح قبض کر کے اُن کا جسم بھی اٹھا لیا جائے گا تاکہ اُن کے دشمن اُس کی توہین نہ کر سکیں۔ مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول تھے اور رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی حفاظت کرتا ہے اور جب تک اُن کا مشن پورا نہ ہو جائے، اُن کے دشمن ہرگز اُن کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اِسی

شَهِيْدًا ﴿١٥٩﴾

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ، وَبِصَدِّهِمْ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿١٦٠﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا، وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ، وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ

(یہ اِن کے جرائم ہیں، اِس لیے اب قرآن کے سوا یہ براہ راست آسمان سے اتری ہوئی کسی کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو اِن کی پروانہ کرو، اے پیغمبر) اِن اہل کتاب میں سے ہر ایک اپنی موت سے پہلے اِسی (قرآن) پر یقین کرلے گا[۲۳۷] اور قیامت کے دن یہ اِن پر گواہی دے گا۔[۲۳۸]
۱۵۹

پھر اِن یہودیوں کے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ایسی پاکیزہ چیزیں بھی اِن پر حرام کر دی تھیں جو اِن کے لیے حلال تھیں[۲۳۹] اور اِس وجہ سے کہ یہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے رہے ہیں اور اِس وجہ سے کہ سود

طرح اُن کی توہین وتذلیل بھی اللہ تعالیٰ گوارا نہیں کرتا اور جو لوگ اِس کے درپے ہوں، اُنھیں ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اپنے رسولوں کو لازماً اُن کی دست درازی سے محفوظ کر دیتا ہے۔

[۲۳۷] اصل الفاظ ہیں: 'لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ'۔ اِن میں لام تاکید اور قسم کا ہے اور ایمان کا لفظ یقین کرنے کے معنی میں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...دین میں معتبر ایمان صرف وہ ہے جو یقین، تصدیق اور اقرار، تینوں اجزا پر مشتمل ہو۔ اِس کے علاوہ ایک وہ ایمان ہے جس کے اندر یقین اور تصدیق کے اجزا تو نہیں پائے جاتے، لیکن اظہار و اقرار کا جزو پایا جاتا ہے، یہ منافقین کا ایمان ہے۔ اِسی طرح ایک وہ ایمان بھی ہے جس کے اندر یقین تو پایا جاتا ہے، لیکن اِس کے اندر تصدیق اور اقرار کے اجزا مفقود ہوتے ہیں، یہ متکبرین اور متمردین کا ایمان ہے۔ اِن پر حق کا حق ہونا تو بالکل واضح ہو جاتا ہے، لیکن وہ اپنی رعونت اور شرارت کی وجہ سے اِس کی تصدیق و اقرار سے گریز کرتے ہیں اور اپنی اِس شرارت کو مختلف بہانوں کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۲۲)

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ تہدید اور وعید کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت جو باتیں اِنھیں دلیل سے سمجھائی جا رہی ہیں، وہی آنے والے دنوں میں واقعہ بن جائیں گی۔ اِنھیں سوچنا چاہیے کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے۔ ماننے کے سوا اُس وقت اِن کے لیے کوئی چارہ نہ ہوگا۔

[۲۳۸] یہ جملہ بھی اُسی تہدید و وعید کا حامل ہے جس کا حامل پہلا جملہ ہے۔

النَّاسِ بِالْبَاطِلِ، وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ، وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ، وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

لیتے رہے ہیں، دراں حالیکہ اِنھیں اِس سے روکا گیا تھا[240] اور اِس وجہ سے کہ یہ لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے رہے ہیں[241]، اور یہ اِنھی کے منکرین ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[242]۔ اِن میں سے، البتہ جو علم میں پختہ ہیں[243] اور جو ایمان والے ہیں[244]، وہ اُس چیز کو مانتے ہیں جو

---

[۲۳۹] سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۴۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر وہ تمام جانور حرام کر دیے گئے تھے جن کے ناخن ہوتے ہیں۔ اِسی طرح گاے اور بکری کی چربی بھی اُن پر حرام تھی۔ اِس کے لیے یہاں 'فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں لفظ 'ظلم' کی تقدیم سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ یہود پر یہ چیزیں خود اُنھی کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے کی وجہ سے حرام کی گئیں، اللہ نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

[۲۴۰] سود کی حرمت کا یہ حکم خروج باب ۲۲ کی آیات ۲۵-۲۷ اور احبار باب ۲۵ کی آیات ۳۵-۳۸ میں پوری صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

[۲۴۱] اِس سے مراد وہ طریقے ہیں جو عدل و انصاف، معروف، دیانت اور سچائی کے خلاف ہوں اور جن میں لین دین اور معاملت کی بنیاد فریقین کی حقیقی رضا مندی پر نہ ہو، بلکہ ایک کا مفاد ہر حال میں محفوظ رہے اور دوسرے کی بے بسی اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اُسے ضرر یا غرر کا ہدف بنایا جائے۔

[۲۴۲] یہ سب باتیں بھی جرائم کی اُسی فہرست سے متعلق ہیں جو اوپر گزر چکی ہے۔ اِس پورے سلسلۂ بیان میں بلاغت کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...بنی اسرائیل کے جرائم کی ایک طویل فہرست تو سنا دی گئی ہے، لیکن الفاظ میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اِس فہرست کے سنانے سے مدعا کیا ہے۔ جرائم کی فہرست کے بیچ میں ایک جملۂ معترضہ آ گیا ہے اور اِس کے ختم ہوتے ہی پھر اِن کے جرائم کے بیان کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اِس کے بعد اقتضاے کلام سے ایک اور طویل جملۂ معترضہ آ گیا ہے اور اُس کے بند ہوتے ہی پھر فہرست جرائم شروع ہو گئی۔ یہ اسلوب بیان... متکلم کے زور بیان اور جوش، سامع کی ذہانت اور ہوش، دعوے کی قوت اور وضاحت اور فیصلے کے مستغنی عن البیان ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ خطباے عرب کے خطبات میں اِس کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن میں بھی آگے اِس کی نہایت بلیغ مثالیں

وَالْـمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ، وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ، وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْـرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ

تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور خاص کر نماز کا اہتمام کرنے والے[۲۴۵] اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم عنقریب اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔ ۱۶۰-۱۶۲

(اِن کی پروانہ کرو، اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف اُسی طرح وحی کی ہے، جس طرح نوح پر اور اُس کے بعد آنے والے پیغمبروں پر کی تھی۔ ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اولاد یعقوب،

آئیں گی۔ اِس طرح کے پرزور کلام کو ایک صاحب ذوق سامع سمجھ تو سکتا ہے، لیکن اِس کے زور اور اِس کی بلاغت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۱۹)

[۲۴۳] اِس سے مراد یہود کے وہ علما ہیں جو دین کے علم میں راسخ، عقیدہ و عمل میں پختہ اور اخلاق و کردار میں ہر پہلو سے جادۂ مستقیم پر استوار تھے۔

[۲۴۴] یعنی وہ عام لوگ جو علما تو نہیں ہیں، مگر اپنی سلامتیِ طبع اور پاکیزگی سیرت و کردار کے باعث اپنے علم کی حد تک تورات کی ہدایت پر قائم اور اِس لحاظ سے گویا سچے اہل ایمان ہیں۔ اہل کتاب کے اِس گروہ کا ذکر اِس سے پہلے آل عمران (۳) کی آیت ۱۱۳ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔

[۲۴۵] اصل الفاظ ہیں: 'وَالْـمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ'۔ اِن میں 'الْمُقِيْمِيْنَ' کا عطف اگرچہ 'الْمُؤْمِنُوْنَ' پر ہے، لیکن یہ عربیت کے اُس قاعدے کے مطابق منصوب ہو گیا ہے جس کو 'علی سبیل الاختصاص' یا 'علی سبیل المدح' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی بلاغت واضح فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''... اسلوب کی اِس تبدیلی کا لفظی اثر تو سامع پر یہ پڑتا ہے کہ یہ تنوع اُس کو لفظ پر متوجہ کر دیتا ہے اور معنوی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محض اسلوب کی تبدیلی سے، بغیر ایک حرف کے اضافے کے، اُس کے اندر اختصاص اور مدح و تعریف کا

وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ، وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ، وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ، وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا

عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف بھی وحی کی اور داؤد کو ہم نے زبور عطا فرمائی تھی[۲۴۶]۔ہم نے اُن رسولوں کی طرف بھی وحی بھیجی جن کا ذکر تم سے پہلے کر چکے ہیں اور اُن رسولوں کی طرف بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا[۲۴۷] اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام کیا تھا، جس طرح کلام کیا جاتا ہے[۲۴۸]۔ یہ رسول جو

مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً، یہی لفظ اپنے عام اسلوب کے مطابق 'وَالْمُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ' ہوتا تو اِس کے معنی صرف یہ ہوتے کہ 'اور نماز کے قائم کرنے والے' لیکن جب اسلوب بدل کر 'الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ' کہہ دیا تو اِس کے معنی یہ ہو گئے کہ 'اور خاص کر نماز قائم کرنے والے'، جس سے اِن موصوفین کی غیر معمولی تعریف اور اِن کی خصوصیت بھی واضح ہوئی اور نماز کی وہ اہمیت وعظمت بھی جو دین کے نظام میں اُس کو حاصل ہے۔'' (تدبرقرآن ۲/۴۲۵)

[۲۴۶] زبور کا لفظ اِس آیت میں نکرہ آیا ہے۔ یہ تفخیم شان کے لیے ہے جس سے الہامی کتابوں میں زبور کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

[۲۴۷] انبیا علیہم السلام کے نام یہاں جس ترتیب سے گنائے گئے ہیں، اُس میں کیا چیز ملحوظ ہے اور اِس تمام حوالے کا مقصود کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِن کی ترتیب حضرت نوح سے لے کر حضرت یعقوب اور اُن کی اولاد کے ذکر تک تو تاریخی ہے، لیکن اِس کے بعد ترتیب صفاتی ہو گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت ہارون اپنے خاص نوع کے ابتلا اور خاص نوع کی تائید الٰہی میں فی الجملہ اشتراک رکھتے ہیں۔ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد دونوں نبی بھی ہیں اور دونوں بادشاہ بھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد لانے کی وجہ خاص اہتمام کے ساتھ زبور کی طرف توجہ دلانا ہے۔ سب سے آخر میں حضرت موسیٰ کا ذکر ہے، اِس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ مماثل نبی ہیں۔ اِس بات کا ذکر قرآن اور احادیث، دونوں میں ہے۔

...اِس تمام حوالے سے قرآن کا مقصود یہ ہے کہ یہ انبیا ہیں جن کے نام اور کام تورات کے صحیفوں میں بھی بیان ہوئے ہیں اور یہ طریقہ رہا ہے کہ جس طریقے پر اللہ نے اِن نبیوں کو اپنی وحی اور اپنے خطاب وکلام سے نوازا ہے۔ اِن سب سے اہل کتاب واقف ہیں، بھلا ہے اِس میں کہیں ذکر اِس بات کا کہ اللہ نے کسی نبی پر اِس طرح کتاب

مُّبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ، وَ کَانَ اللّٰہُ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ﴿۱۶۵﴾

بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر بھیجے گئے تاکہ اِن رسولوں کے بعد اللہ کے سامنے کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔[۲۴۹] اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۱۶۳-۱۶۵

اتاری ہو کہ اُس کو اترتے سب نے دیکھا ہو؟ موسیٰ سے بے شک اللہ تعالیٰ نے کلام کیا، جس طرح کلام کیا جاتا ہے، لیکن اِن یہود کا اطمینان اِس سے بھی نہ ہوا۔ اُنھوں نے اِس پر بھی یہ شبہ وارد کر دیا کہ جب تک خدا ہم سے رو در رو ہو کر کلام نہ کرے، ہم کس طرح باور کریں کہ وہ تم سے کلام کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۳۱)

[۲۴۸] یہ موسیٰ علیہ السلام کا خاص امتیاز ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن سے خطاب و کلام کی شان اُس سے مختلف تھی جو دوسرے انبیا کے ساتھ تھی۔ تاہم یہ خطاب و کلام بھی خدا سے رو در رو نہیں، بلکہ 'مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ'، یعنی پردے کی اوٹ ہی سے تھا۔

[۲۴۹] یہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی بعثت کا مقصد بھی بتا دیا ہے اور وہ ضرورت بھی جو اِن کے بھیجنے کی داعی ہوئی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ انذار و بشارت کے لیے آتے ہیں تاکہ لوگوں کو غفلت سے بیدار کیا جائے اور اُن کو بھیجنے کی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ علم و عقل کی شہادت کے بعد ایک دوسری شہادت بھی پیش کر دی جائے جو حق کو اِس درجہ واضح کر دے کہ کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

کفارۂ نذر

عَنِ[1] ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ يُسَمِّهِ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ[2] فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَا يُطِيْقُهُ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا أَطَاقَهُ فَلْيَفِ بِهِ.

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کوئی غیر متعین نذر[1] مانی تو اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے اور جس نے اللہ عزوجل کی معصیت کی کوئی نذر مانی تو اس کا کفارہ بھی وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے اور جس نے کوئی ایسی نذر مانی جس کی وہ طاقت ہی نہیں رکھتا تھا[2] تو اس کا کفارہ بھی وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے اور جس نے کوئی ایسی نذر مانی جس کی وہ طاقت رکھتا تھا تو اسے چاہیے کہ اسے پورا کرے[3]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ غیر متعین نذر سے مراد وہ نذر ہے جس میں یہ طے نہ ہو کہ آدمی روزے رکھے گا یا نوافل پڑھے گا اور روزے

رکھے گا تو کتنے رکھے گا یا نوافل پڑھے گا تو کتنے پڑھے گا۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب مثلاً، آدمی ان الفاظ سے نذر مانے کہ فلاں کام ہو گیا تو میں اللہ کی عبادت کروں گا یا میں نیکی کروں گا یا یہ کہ میں روزے رکھوں گا یا نوافل پڑھوں گا۔

۲۔ بعض اوقات انسان کسی جذباتی کیفیت میں ایسی نذر مان لیتا ہے جسے وہ پورا نہیں کر سکتا تو اس صورت میں اسے چاہیے کہ اپنی نذر کا کفارہ دے دے۔

۳۔ نذر اپنی حقیقت میں انسان کی طرف سے خدا کے ساتھ کسی نیک عمل کا عہد ہوتی ہے۔ چنانچہ جب وہ اسے پورا کر سکتا ہو تو اسے چاہیے کہ لازماً پورا کرے۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ابوداؤد کی روایت، رقم ۳۳۲۲ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ مضمون یا اس کے کچھ حصے حسب ذیل (۷) مقامات پر نقل ہوئے ہیں۔

بیہقی، رقم ۱۹۶۹۷، ۱۹۶۹۸، ۱۹۸۶۴؛ ابن ماجہ، رقم ۲۱۲۷، ۲۱۲۸؛ ترمذی، رقم ۱۵۲۸؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۱۸۳۔

بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۱۲۷ میں 'لَمْ يُسَمِّهِ' (اس نے اسے متعین نہیں کیا) کے بجائے 'وَلَمْ يُسَمِّهِ' (اور اس نے اسے متعین نہیں کیا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۱۲۸ میں 'لَا يُطِيقُهُ' (وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا) کے بجائے 'لَمْ يُطِقْهُ' (وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ترمذی، رقم ۱۵۲۸ میں 'مَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ يُسَمِّهِ فَكَفَّارَتُهُ' (جس نے کوئی غیر متعین نذر مانی تو اس کا کفارہ) کے بجائے 'كَفَّارَةُ النَّذْرِ إِذَا لَمْ يُسَمَّ' (نذر کا کفارہ جبکہ وہ غیر متعین ہو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۹۷ میں اس روایت سے متعلق حصے کے علاوہ 'كَفَّارَةُ النَّذْرِ كَفَّارَةُ الْيَمِينِ' (نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۸۶۴ میں 'مَعْصِيَةٍ' (گناہ) کے بجائے 'مَعْصِيَةِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ' (اللہ عزوجل کی نافرمانی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۱۸۳ میں 'لَمْ یُسَمِّهِ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ یَمِینٍ' (اس نے اسے متعین نہیں کیا تو اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے) کے بجائے 'فَلَمْ یُسَمِّهِ فَعَلَیْهِ كَفَّارَةُ یَمِینٍ' (پھر اس نے اسے متعین نہیں کیا تو اس کے ذمے قسم کا کفارہ ہوگا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۲۔ 'اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ' کے الفاظ بیہقی، رقم ۱۹۸۶۴ سے لیے گئے ہیں۔

طالب محسن

باہمی محبت کا سبب

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلیَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا وَلَاتُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا. اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ. اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک ایمان نہ لاؤ۔ صاحب ایمان نہیں ہو سکتے جب تک باہم محبت نہ کرو۔ میں تمھیں وہ چیز نہ بتاؤں، جب تم اسے کرو تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو۔ اپنے بیچ سلام کو پھیلاؤ۔

معنی

اس روایت میں پہلی بات یہ بیان ہوئی ہے کہ کوئی شخص ایمان کے بغیر جنت میں نہیں جا سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ایمان سے کیا مراد ہے۔ شارحین نے اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا ہے۔ ایک یہ کہ یہاں ایمان ظاہری اور اطلاقی معنی میں آیا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہاں ایمان شرعی مراد ہے اور اس سے ان چیزوں پر یقین مراد ہے جن کا ذکر حدیث جبریل[1] میں ہوا ہے۔ دونوں باتیں اصل میں ایک ہیں۔ وہ ایمان جو شرط نجات ہے، وہ دائرۂ دین

[1] مسلم، رقم ۹۔ فقال یا رسول اللّٰہ ما الایمان. قال ان تومن باللّٰہ وملائکته و کتابه ولقائه ورسله و تؤمن

میں داخل ہونا ہے۔ظاہر ہے اس میں جہاں ماننے کی چیزیں شامل ہیں، وہاں کرنے کی چیزیں بھی شامل ہیں۔ مسلمان ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی اس کائنات کے خالق کو مانے، اس زندگی کے بارے میں اس کی بنائی ہوئی اسکیم کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اپنے پروردگار کے اوامر و نواہی کا کاربند ہونے کا فیصلہ کرے۔ شارحین نے جو بات بیان کی ہے، وہ اصولاً درست ہے، لیکن ان کے اس بیان میں ایمان و عمل کے باہمی تعلق کے ناگزیر ہونے کا پہلو نظر انداز ہو گیا ہے۔قرآن مجید نے جہاں بھی نجات کے حوالے سے بات کی ہے، وہاں ایمان کے ساتھ اعمال صالح کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایمان اور اعمال صالح میں باطن اور ظاہر کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ جس طرح اگر ایمان نہ ہو تو اعمال صالح کا میزان میں کوئی وزن نہیں ہے، اسی طرح اگر اعمال صالح نہ ہوں تو ایمان کے معدوم ہو جانے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

اس روایت میں دوسری بات یہ بیان ہوئی ہے کہ تم اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہو سکتے جب تک باہم محبت نہ کرو۔ یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں ایمان کس معنی میں ہے۔ شارحین نے یہاں بھی دو تعبیرات اختیار کی ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں ایمان کا لفظ کامل ایمان کے معنی میں آیا ہے، یعنی وہ شخص کامل ایمان والا نہیں ہو سکتا جو اپنے مسلمان بھائیوں سے محبت نہ رکھتا ہو۔ دوسری یہ کہ یہاں عملی ایمان مراد ہے، یعنی اس جملے میں ایمان کے اسی پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو ایمان کے ستر سے کچھ زیادہ شعبوں والی روایت میں ملحوظ ہے۔

ایمان کے شعبوں والی روایت ہو یا ایمان سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے ارشادات، کم و بیش ہر بیان میں ایمان اور عمل صالح کے باہم ناگزیر ہونے کا پہلو نمایاں ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس ارشاد میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کا لفظ اس کے بدیہی تقاضوں کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ محض کچھ عقائد کا مان لینا نہ پہلے جملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ہے اور نہ دوسرے جملے ہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کچھ اور ہے۔ یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا کی بندگی اور آخرت کی جواب دہی کا صحیح شعور پیدا ہو گیا ہے، ناگزیر ہے کہ اس کے ہاں دوسرے کے بارے میں ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات پیدا ہوں۔ یہی چیز ہے جس کے لیے اس روایت میں 'تحاببتم' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

بالبعث الآخر' (پوچھا: یا رسول اللہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتاب پر، اس سے ملاقات پر اور دوبارہ جی اٹھنے پر ایمان لائے)۔

اس روایت میں تیسری بات یہ بیان ہوئی ہے کہ باہم محبت پیدا کرنے کا ذریعہ السلام علیکم کے کلمے کا مسلم معاشرے میں عام ہونا ہے۔ السلام علیکم کا کلمہ ایک دعا ہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملتا ہے تو اس کے حفاظت اور امن امان کی دعا دیتا ہے۔ یہ دعا اگر صحیح شعور کے ساتھ دی جائے تو ہمدردی اور محبت کے جذبات اس دعا کا باعث بھی ہیں اور اس دعا سے یہ جذبات قوت بھی پاتے ہیں۔ جس شخص سے ملتے وقت ہم نے اس کے لیے سلامتی کی دعا کی ہے، اس کی بدخواہی اور اس سے نفرت ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ جب ہم ہر ملنے والے سے اس دعا کے ساتھ ملنے کی عادت بنا لیں گے تو باہمی محبت کی یہ منزل کا حاصل ہونا ناگزیر ہے۔

یہ روایت بھی اعلیٰ اخلاق اور ایمان کے باہمی تعلق کو واضح کرتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں میں اعلیٰ اخلاقی رویوں کی آبیاری اور اخروی اعتبار سے ان کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے متعدد اسالیب اختیار کیے ہیں: ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں''۔ ''ایمان کا ادنیٰ شعبہ یہ ہے کہ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹا دی جائے۔'' یہ اور اس طرح کی تمام روایتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور وہ یہ کہ اعلیٰ اخلاق اور ایمان لازم وملزوم ہیں۔

متون

بعض متون سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کے ساتھ کچھ اور باتیں بھی فرمائی تھیں۔ مثلاً ایک روایت میں اس جملے سے پہلے 'لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهُ' کا جملہ بھی نقل ہوا ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں 'دَبَّ اِلَيْكُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمْ اَلْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ اَمَا اِنِّيْ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ' کی بات بھی بیان کی گئی ہے۔ کچھ راویوں نے اس جملے کو روایت کے شروع میں نقل کیا ہے اور کچھ نے روایت کے آخر میں نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ زیر بحث متن کے الفاظ میں بھی جزوی اختلافات ہیں۔ 'لَا تَدْخُلُوْنَ' کی جگہ 'لَا تَدْخُلُوْا' کا صیغہ بھی آیا ہے۔ ایک متن 'حَتّٰى تُؤْمِنُوْا' کے بجائے 'حَتّٰى تُسَلِّمُوْا' کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض متون میں روایت کا آغاز 'وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ' کی قسم سے ہوا ہے۔ 'اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ' کا جملہ بعض الفاظ کے فرق کے ساتھ روایت ہوا ہے۔ 'اَوَلَا' کی جگہ 'اَفَلَا'، 'اَلَا'، 'هَلْ'، 'اِنْ شِئْتُمْ'، 'شَيْءٍ' کی جگہ 'اَمْرٍ' اور 'فَعَلْتُمُوْهُ' کی جگہ 'اَتَيْتُمُوْهُ' آیا ہے۔

کتابیات

مسلم، رقم ۵۴؛ ابوداؤد، رقم ۵۱۹۳؛ ترمذی، رقم ۲۶۸۸؛ ابن ماجہ، رقم ۶۸؛ احمد، رقم ۹۲۳۶، ۹۷۰۷، ۱۰۱۸۰، ۱۰۶۵۸؛ ابن حبان، رقم ۲۳۶؛ بیہقی، رقم ۲۰۸۵۳؛ معجم کبیر، رقم ۹۸۷۷، ۱۰۳۹۶؛ اسحاق بن راہویہ، رقم ۳۸۵، ۵۳۴؛ الادب المفرد، رقم ۲۶۰، ۹۸۰؛ مسند الشامیین، رقم ۱۷۱، ۱۷۲؛ عبد بن حمید، رقم ۹۷۔

ساجد حمید

سمندر کی مردہ تیرتی مچھلی

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَلْقَى الْبَحْرُ أَوْ جَزَرَ عَنْهُ فَكُلُوْهُ وَمَا مَاتَ فِيْهِ وَطَفَا فَلَا تَأْكُلُوْهُ.[1]

(سنن ابی داؤد، رقم ۳۸۱۵)

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مچھلی سمندر خشکی پر پھینک دے یا جسے سمندر سے پکڑ کر کاٹا جائے تو اسے تو کھالو، مگر جو سمندر کے اندر ہی مر جائے اور اس کی سطح پر تیرنے لگے تو اسے مت کھاؤ۔[1]

ترجمے کے حواشی

۱۔ اس روایت میں ایک مشکل ہے کہ سمندر کے اندر مرنے اور باہر مرنے میں کیا فرق ہے۔ 'طفا' (تیرنے لگے) کی شرط سے کچھ واضح نہیں ہوتا، اس لیے کہ جب بھی کوئی چیز پانی میں مرتی ہے تو وہ اس کی سطح پر تیرنے لگ جاتی ہے۔ مردہ مردہ ہی ہے، خواہ پانی میں مرے یا باہر۔ قرآن مجید نے 'صید البحر' اور 'طعامہ' کو حلال کیا ہے (مائدہ ۵: ۹۶)۔ پھر 'میتۃ' (البقرہ ۲: ۱۷۳) کے معنی میں داخل نہ ہونے کی بنا پر مردہ مچھلی کی حلت باقی رہی۔ اب اس روایت میں جو نیا استثنا نکالا گیا ہے، وہ بظاہر درست نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ 'طفا' کی جگہ پر کوئی اور وصف بیان ہوا تھا،

جسے راوی بھول گئے، جیسے یہ کہ جو بدبودار ہو جائے یا پھول جائے وغیرہ۔ یہ اوصاف مچھلی کے باسی ہونے کی علامت ہیں۔ ظاہر ہے ایسی مچھلی نہیں کھائی جاتی۔ یہ روایت اپنی سند میں قابل احتجاج نہیں ہے، اس لیے جمہور علما نے اس سے استدلال نہیں کیا۔

چنانچہ یہ بات معلوم ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق اور ابوایوب رضی اللہ عنہما نے ایسی مچھلی کو مباح قرار دیا ہے، اور یہی راے امام شافعی اور نخعی اور ثوری رحمہم اللہ کی ہے (المغنی ۹/ ۳۱۴)۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسے حلال کہا ہے (مصنف ابن ابی شیبہ ۴/ ۲۴۸)۔

متن کے حواشی

یہ روایت ابن ماجہ، رقم ۳۲۴۷؛ بیہقی، رقم ۱۸۷۶۷، ۱۸۷۶۸ میں آئی ہے۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔

پروفیسر خورشید عالم

قاہرہ میں چندروز ــــ علمی مشاہدات

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

ـــــ ۴ ـــــ

مقام الامام شافعی

مذکورہ آثار سے فارغ ہو کر میں ٹیکسی کے ذریعے سے امام شافعی کے مدفن تک پہنچا۔ یہ ایک وسیع قبرستان ہے جو امام شافعی کی قبر کی وجہ سے مقام الامام الشافعی کے نام سے مشہور ہے۔ قاہرہ کے جنوب میں جبل مقطم اور قدیم قاہرہ کے درمیان بائیں ہاتھ ایک میدان ہے جس میں ممالیک کے زمانہ کی خستہ حال جنازگاہیں نظر آتی ہیں۔ جب ہم جنوب کی طرف رخ کرتے ہیں تو بہت سی نئی قبروں کے درمیان خاکستری رنگ کا گنبد دکھائی دیتا ہے جس کے نیچے یہ عظیم امام محو خواب ہے۔ امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس قریشی مطلب بن عبدمناف کی اولاد سے ہیں۔ ۱۵۰ھ میں غزہ میں اس دن پیدا ہوئے جس دن امام ابوحنیفہ کی وفات ہوئی۔ دو برس کی عمر میں غزہ سے مکہ مکرمہ پہنچے اور وہیں ان کی والدہ نے ان کی تربیت کی۔ ۱۰ برس کی عمر میں ''موطا'' حفظ کی اور اور پندرہ برس کی عمر میں فتویٰ دیا۔ امام مالک سے ان کی ''موطا'' پڑھی۔ انھوں نے خلیفہ مامون عباسی کا زمانہ پایا۔ عربی لغت اور شعر کا ذوق سب ائمہ سے بڑھ کر تھا۔ دس برس قبیلہ ھذیل میں ٹھہرے رہے اور انھی سے عربی لغت اور فصاحت سیکھی۔ اصمعی جو لغت ونحو کے امام تھے، ان کے پاس رہ کر ھذیلیوں کے اشعار پڑھتے رہے۔ وہ اصول فقہ کے موجد ہیں۔ اس فن پر سب سے پہلی کتاب امام شافعی

کی ''الرسالہ'' ہے۔ امام احمد بن حنبل مسلسل چالیس برس تک ان کے لیے نماز میں دعا مانگتے رہے۔ انھی کا قول ہے کہ پہلی صدی کے مجدد عمر بن عبدالعزیز ہیں اور دوسری صدی کے مجدد امام شافعی۔ ۱۹۹ھ یا ۲۰۰ھ میں مصر میں داخل ہوئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ان کا قیام فسطاط میں تھا۔ انھوں نے سیدہ نفیسہ رحمۃ اللہ علیہا سے حدیث سنی، جامع عمرو بن العاص کی مسند تدریس پر بیٹھ کر اپنا مذہب املا کراتے رہے۔ ان کا مسلک اہل الرائے اور اہل الحدیث کے بین بین ہے۔ ان کی وفات رجب کے آخری دن جمعرات یا جمعہ کے دن ۵۴ برس کی عمر میں ۲۰۴ھ (۸۱۹ء) میں مصر میں ہوئی۔

مرقد کا دروازہ ایک پکی سڑک پر کھلتا ہے جس کے اردگرد احمد بن طولون کے وقت کی عمارتیں ہیں۔ چار دروازوں سے گزر کر اندر جانا پڑتا ہے۔ بیرونی دروازے کے اوپر پتھر کی سل پر یہ شعر رقم ہے:

وإن رمتَ فضل الشافعی — من مسند قدصح قدما

هو من قریش عالم — یملأ طباق الارض علما

''اگر تو کسی قدیم اور صحیح مسند سے امام شافعی کی فضیلت جاننے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ قریش کے عالم تھے جنھوں نے زمین کی تہوں (روئے زمین) کو علم سے بھر دیا۔''

قبر ہال کمرے کے اندر ہے۔ قبر کے ایک طرف نقدی، کپڑوں اور کاغذ کے رقعوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے جنھیں غالباً عقیدت مندوں نے وہاں پھینکا تھا۔ کہاں امام شافعی اور کہاں یہ خرافات، وہ امام شافعی جن کے بارے میں امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ مجھے حدیث کے ناسخ و منسوخ کا علم اس وقت تک نہ ہوا جب تک میں امام شافعی کے پاس نہ بیٹھا۔

قصر مانیل (Manial Palace)

یہ محل محمد علی پاشا کے پوتے محمد علی کا ہے اور قاہرہ میں مینیل نامی علاقہ میں واقعہ ہے۔ بڑے گیٹ سے دائیں طرف ایک کلاک ٹاور ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی خوب صورت مسجد ہے جس کی چھت یوں دکھائی دیتی ہے جیسے آسمان پر تارے ٹمٹما رہے ہوں۔ مسجد کے ساتھ ہی شکار کا میوزیم ہے جو اپنی نوعیت میں منفرد ہے۔ تمام شکار کیے ہوئے جانوروں کی کھال کو بھر (Stuff) کر ان کو اصلی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ہر قسم کے پرندے اور درندے موجود ہیں۔ میوزیم کے آخر میں ایک جنگل میں شیر کا مجسمہ دکھایا گیا ہے۔

یہاں سے فارغ ہوکر ہم محل کی عمارت کی طرف گئے جو کچھ فاصلہ پر تھی۔ داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال تھا جس کے اردگرد زائرین کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے۔ تعمیر میں شاہانہ جلال اور دبدبہ تھا۔ محل دومنزلہ تھا۔ نچلی منزل دیکھ چکے تو دربان نے اوپر والی منزل دیکھنے کی اجازت نہ دی۔ کچھ بخشش دے کر اوپر والی منزل پر گئے۔ سیڑھیوں کی دیوار پر بڑے محمد علی کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ اس منزل پر شہزادوں اور شہزادیوں کی رہایش تھی۔ پرائیویٹ بیڈ روم، مسہریاں اور سنگ مرمر کے بنے ہوئے حمام تھے۔ ایک کمرا موسیقی کے لیے مخصوص تھا جس پر بیٹھنے کے لیے قالین اور غالیچے بچھے ہوئے تھے۔ آلات طرب بھی موجود تھے۔ موسیقاروں کے لیے ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ اس زمانے کا فرنیچر اور برتن سبھی محفوظ تھے۔

مسجد سیدہ نفیسہ رحمۃ اللہ علیہا

محل دیکھنے کے بعد ٹیکسی والا ہمیں مسجد سیدہ نفیسہ لے گیا۔ امام شافعی کے مرقد سے نکل کر باب سیدہ نفیسہ کے راستے قاہرہ کا رخ کریں تو دائیں ہاتھ ایک پرانے دروازے کے قریب ایک پکی سڑک ہے جس کے آخر میں ایک خوب صورت نو تعمیر شدہ مسجد ہے بس یہی سیدہ نفیسہ کی مسجد ہے۔ اس مسجد کی بنیاد الحسن الانور بن زید الابلج بن الامام حسن بن علی بن ابی طالب نے رکھی۔ سیدہ نفیسہ بنت ابی محمد الحسن بن زید بن الحسن بن علی قریشی ہاشمی ہیں۔ وہ مکہ میں پیدا ہوئیں، ان کے والد مدینہ منورہ میں پانچ برس تک خلیفہ منصور کی نیابت کرتے رہے۔ بعد میں کسی بات پر ناراض ہوکر خلیفہ نے ان کو بغداد میں قید کر لیا اور ان کی ساری جائداد ضبط کر لی۔ خلیفہ مہدی نے اپنی خلافت میں آزاد کر کے ساری جائداد واگزار کرا دی۔ ان کی وفات ۸۵ برس کی عمر میں حاجر (مدینہ سے پانچ میل دور) کے مقام پر ہوئی۔ امام نسائی نے ان کی ایک روایت عکرمہ اور ابن عباس کے حوالہ سے نقل کی ہے: 'ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احتجم وھو محرم '، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام میں پچھنے لگوائے''۔ ابن معین اور ابن عدی نے ان کو ضعیف کہا ہے جبکہ ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے۔ زہیر بن بکار نے ان کی سیادت اور شرافت کی تعریف کی ہے۔ سیدہ نفیسہ امام جعفر الصادق کے بیٹے اسحاق کی بیوی تھیں اور انھی کے ہمراہ ۱۹۳ھ میں مصر میں داخل ہوئیں اور وہیں کی ہو رہیں۔ وہ ایک عالم، متقی اور پاک باز عورت تھیں، صاحب ثروت تھیں، اس لیے لوگوں کے ساتھ عام طور پر اور مریضوں کے ساتھ خاص طور پر حسن سلوک کیا کرتی تھیں۔ جامع عمرو بن العاص میں امام لیث

بن سعد کے بعد مسند تدریس پر فائز رہیں۔ جب امام شافعی مصر میں داخل ہوئے تو ان کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث سنی۔ وہ امام شافعی کے ساتھ حسن سلوک کرتیں اور ابن کثیر نے لکھا ہے کہ امام شافعی اکثر رمضان المبارک میں ان کے یہاں نماز پڑھتے۔ جب امام موصوف کا انتقال ہوا تو سیدہ نفیسہ نے ان کے جنازہ کو لانے کا حکم دیا اور اپنے گھر میں ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ اس بات کا ذکر ابن کثیر اور ابن خلکان، دونوں نے کیا ہے۔ روایت ہے کہ جب تک امام صاحب کی قبر نہ بنی، ان کی میت سیدہ نفیسہ کے گھر میں رہی۔

ایک دفعہ جب انھوں نے مکہ واپس جانے کا ارادہ کیا تو والی مصر نے ان کے لیے ایک بہت بڑا گھر وقف کر دیا۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ وہاں عبادت کریں۔ اور صرف دو دن تعلیم و تربیت کے لیے مخصوص کر دیں تا کہ لوگ ان کے علم و فضل سے مستفید ہوتے رہیں۔ جس جگہ یہ گھر تھا وہ درب السباع کے نام سے مشہور تھا۔ اب سیدہ کی قبر کے سوا وہاں کچھ باقی نہیں بچا۔ ان کی وفات اسی گھر میں رمضان ۲۰۸ھ بمطابق ۸۲۳ء میں ہوئی اور وہیں دفن ہوئیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے شوہر اسحاق بن جعفر نے میت مدینہ منورہ لے جانی چاہی تو مصر کے شیوخ و علما نے اصرار کیا کہ آپ کو مصر میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ آپ کو اسی گھر میں دفن کر دیا گیا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ:

''سیدہ نفیسہ رضی اللہ عنہا کی قبر قبولیت دعا کے لیے مشہور ہے اور یہ بات آزمودہ ہے۔''

مسجد بہت ہی خوب صورت بنی ہوئی ہے۔ خواتین کے لیے مسجد میں داخل ہونے کا راستہ الگ ہے۔ جب میں مسجد میں داخل ہوا تو نماز ظہر کا وقت قریب تھا۔ یہ ذہن میں رہے کہ پورے مصر میں نماز ظہر اول وقت یعنی سوا بارہ یا ساڑھے بارہ بجے ہوتی ہے۔ مسجد میں مصری قاری کی خوب صورت آواز میں تلاوت ہو رہی تھی۔ نماز با جماعت ادا کی۔ سیدہ نفیسہ جس کمرے میں رہتی تھیں، وہیں مدفون ہیں۔ قبر کے اردگرد برونز کی جالی ہے۔ میں نے قبر پر جا کر دعا کی۔ زائرین بالخصوص خواتین کا ہجوم تھا۔ کیا مرد اور کیا عورتیں سب گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ سیدہ کا زمانہ دوسری صدی ہجری صحابہ اور تابعین کرام کا زمانہ تھا۔ عورت کے احترام کا یہ عالم تھا کہ امام شافعی کے رتبے کا فاضل ایک عورت کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر رہا ہے۔ جب ان کی وفات ہوتی ہے تو مصر کے مشائخ اور علما ضد کرتے ہیں کہ ان کو مصر ہی میں دفن کیا جائے اور ان کی قبر پر دعا مانگنے کو باعث سعادت سمجھتے ہیں اور ہمارے یہاں کے مذہبی پیشوا ابھی تک عورت پر مرد کی فضیلت کو ثابت کر رہے ہیں:

ببیں تفاوت راہ است از کجا تا بہ کجا

مدفن امام لیث بن سعد

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔ وہ اہل مصر کے حدیث، فقہ اور عربی زبان کے امام تھے۔

وہ ۹۴ھ میں مصر میں قلقشندہ (زیریں مصر۔ ڈیلٹا) میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۲ھ میں بیس برس کی عمر میں حج کیا۔ اور نافع مولیٰ ابن عمر سے حدیث سنی۔ امام شافعی کا قول ہے کہ امام لیث امام مالک سے بڑے فقیہ تھے، مگر ان کے شاگردوں نے انھیں ضائع کر دیا۔ ابن وہب امام شافعی کو امام لیث کے مسائل پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ایک مسئلہ میں کسی اجنبی نے کہا کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ امام لیث امام مالک کے جوابات سن کر جواب دیتے تھے تو ابن وہب نے اسے ٹوک کر کہا، بلکہ امام مالک امام لیث کے جوابات سن کر جواب دیتے تھے۔ صاحب حیثیت تھے اور ہاتھ کے بڑے کھلے (سخی) تھے۔ ان کو اپنی زمین سے پانچ ہزار دینار اور ایک روایت کے مطابق اسی ہزار دینار سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ ''البدایہ والنہایہ'' (۱۶۶/۱۰) میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ''امام مالک نے اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر عصفر یعنی زعفران کا ذب (Saf flower) امام لیث سے ہدیۃً منگوا بھیجا تو آپ نے اس کے تیس پیکٹ بھجوا دیے۔ امام مالک نے اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لے لیا۔ کچھ پانچ سو دینار میں بیچ دیے اور کچھ ان کے پاس باقی بچ گئے۔ جب امام لیث حج پر آئے تو امام مالک نے ایک بڑی طشتری میں تازہ کھجوریں بھیجیں۔ امام لیث نے اسی طشتری میں ایک ہزار دینار بھجوا دیے۔ اسی طرح ایک ہزار دینار کی رقم تو وہ اپنے اصحاب میں سے کسی کو بھی بھیجتے رہتے تھے۔ وہ اور ان کے ساتھی کشتی میں سوار ہو کر اسکندریہ جاتے تھے اور کشتی ہی میں کھانے پینے کا بندوبست ہوتا تھا۔''

وہ نصف شعبان بروز جمعہ ۱۷۵ھ میں فوت ہوئے اور اسی روز انھیں القرافۃ الصغریٰ (چھوٹے قبرستان) میں دفن کر دیا گیا۔ ابن خلکان نے ان کے ایک شاگرد کا قول نقل کیا ہے کہ جب ہم نے امام کو دفن کر دیا تو ہاتف غیبی کو یہ شعر پڑھتے سنا:

ذهب الليث فلا ليث لكم   و مضى العلم قريبا و قبر

''لیث چل دیے اور تمھارے لیے کوئی لیث (شیر) نہیں اور ابھی ابھی علم چل دیا اور قبر میں دفن کر دیا گیا۔''

اس جلیل القدر امام کا مقبرہ جامع سیدہ نفیسہ کے قریب ایک چھوٹے اور خستہ حال حوش (احاطہ) میں واقع ہے۔ زیارت کے لیے گیا تو مقبرہ مرمت کے لیے بند تھا۔ نئی چھتوں کے لیے شٹرنگ کی ہوئی تھی۔ سرہانے کھڑے ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کہ اللہ ہمارے علم میں اضافہ کرے۔ ہمارے یہاں کی طرح یہاں بھی مزار پر خادم (مجاور) بخشیش (زکوٰۃ) مانگتے ہیں۔ ایک کو دو تو تین اور آپ کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں۔ ایک خادم نے ایک قبر کی طرف

اشارہ کر کے بتایا کہ امام کے پوتے کی قبر ہے۔ اس کے بعد ٹیکسی والا ہمیں دو عظیم مسجدیں دکھلانے لے گیا۔

مسجد سلطان حسن

شارع محمد علی کے ایک کنارے قلعہ کے دامن میں دو بلند و بالا عظیم الشان مسجدیں آمنے سامنے واقع ہیں، ان کے درمیان گزرنے والی سڑک یوں دکھائی دیتی ہے جیسے کہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی۔

مسجد سلطان حسن مصر کی خوب صورت ترین عمارتوں میں سے ایک ہے۔ اس کا بے مثال گنبد، اس کے میناروں کی رفعت اور اس کی بے شمار وسعت اس کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک افسانوی روایت کے مطابق جب سلطان حسن نے اس عمارت کو دیکھا تو وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے حکم دیا کہ اس فن تعمیر کے ماہر کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں جس نے اس کا ڈیزائن بنایا تھا تاکہ وہ اس جیسی کوئی اور عمارت ڈیزائن نہ کر سکے۔

ناصر بن قلادون کا ساتواں بیٹا الملک الناصر حسن ۱۳۴۷ء میں تخت نشین ہوا۔ مسجد کی تعمیر ۷۵۸ھ (۱۳۵۶ء) میں شروع ہوئی اور تین برس میں مکمل ہوئی۔ تین برس تک روزانہ ۲۰ ہزار سونے کے درہم خرچ ہوتے رہے۔ اس کا کل رقبہ تقریباً ۱۱۰۰ میٹر مربع ہے۔ بیرونی دیواروں کی اونچائی ۴۰ میٹر سے زیادہ ہے اور بڑے گیٹ کے قریب دیواروں کی موٹائی ۸ میٹر ہے۔ جنوب مشرقی گوشہ میں مینار کی اونچائی ۸۰ میٹر ہے اور گنبد کی اونچائی ۵۵ میٹر ہے۔ اندر داخل ہونے والے زائر پر مسجد کی شکوہ دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ مسجد کے ہال سے پہلے بہت بڑا صحن ہے جس کے چاروں طرف چار بڑے برآمدے ہیں، جہاں مذاہب اربعہ کے مطابق درس دیا جاتا تھا۔ صحن کے وسط میں وضو کے لیے بہت بڑا تالاب ہے جس کے اوپر پیاز کی شکل کا گنبد ہے جو آٹھ نیلے ستونوں پر کھڑا ہے۔ مرکزی تالاب کے ایک طرف فوارہ ہے جس میں وضو کے لیے ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ محراب کی داخلی زیب و زینت بڑی سادہ ہے۔ اس کے ایک طرف ۴ چھوٹے مرمری ستون ہیں جن کے اطراف میں پتوں کی شکلیں کھدی ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے ایک چبوترہ ہے جو تین بڑے اور آٹھ چھوٹے ستونوں پر کھڑا ہے۔ جہاں پر قاری حضرات اور فقہا بیٹھتے ہوں گے۔ منبر عام سا ہے۔ سلطان حسن (گائیڈ کے مطابق اس کے بیٹے) کی قبر مربع شکل کے ایک کمرے میں ہے۔ اس کے ایک کنارے پر لکڑی کے ایک بڑے ٹکڑے پر گل کاری کی ہوئی ہے۔ لوح قبر پر ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) لکھا ہوا ہے۔ مسجد میں موجود ایک گائیڈ نے بتایا کہ سلطان حسن ایک معرکہ میں قتل ہو گیا تھا۔ اس کی قبر نامعلوم ہے۔ یہ اس کے بیٹے کی قبر ہے۔ فرانسیسیوں نے ۲۱ اکتوبر ۱۷۹۷ میں قاہرہ کی شورش کے درمیان اسی مسجد

میں پناہ لی تھی۔

سلطان حسن کی جامع مسجد مصر کی وہ تنہا یادگار ہے جو جوں کی توں محفوظ ہے۔ ساڑھے چھ سو سال کے عرصہ نے ان موٹی دیواروں پر جو اہرام کے مواد سے بنی ہوئی ہیں، ذرہ برابر بھی اثر نہیں کیا اگرچہ داخلی آرایش اپنی اصلی حالت میں نہیں رہی۔

مسجد الرفاعی

مسجد سلطان حسن کے بالکل سامنے سڑک کی دائیں جانب مسجد الرفاعی ہے۔ اس کی کرسی نسبتاً اونچی ہے۔ داخل ہونے کے لیے کافی سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ یہ مسجد اپنی بلندی اور ضخامت میں مسجد حسن کی مانند ہے۔ مسجد کے اندر ہوا کی آمد و رفت کا اتنا خوب صورت قدرتی انتظام ہے کہ نماز کے ہال میں بغیر پنکھوں کے ہوا کے جھونکے محسوس ہوتے ہیں۔

یہ مسجد خدیو اسماعیل کی والدہ ہوشیار خانم کے حکم سے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ فن تعمیر کے ماہر حسین پاشا فہمی الرفاعی نے اس مسجد کا ڈیزائن بنایا۔ وہ اس مسجد میں مدفون ولی اللہ علی ابی الشباک کی اولاد سے تھا جو عراق میں مدفون الرفاعی الکبیر کے نواسے تھے، اسی لیے اس مسجد کا نام مسجد الرفاعی ہے۔ مسجد کے اندر داخل ہو کر دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کی۔ مسجد کے اندر علی بن ابی الشباک، خدیو اسماعیل پاشا، اس کی بیگمات اور اس کی والدہ ہوشیار خانم، شاہ فاروق اول اور شاہ فواد اول کی سنگ مرمر کی بنی ہوئی ترکی طرز تعمیر کے مطابق اونچی اونچی قبریں ہیں۔ ان قبروں کے ایک گوشہ میں پہلوی خاندان کا عظیم شہنشاہ رضا شاہ محو خواب ہے۔ اتنی طاقت اور دبدبے کے باوجود اسے اپنے ملک میں دفن ہونے کے لیے دو گز زمین تک نہ ملی، کیونکہ ایران کے عوام ایسا نہیں چاہتے تھے۔ امریکا کا چہیتا ہونے کے باوجود امریکا نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ یہ قبر سبز سنگ مرمر سے ایک سادہ سے پلیٹ فارم پر بنی ہوئی ہے۔ سر بالیں ایرانی جھنڈا لہرا رہا ہے اور پھولوں کا ایک گلدستہ پڑا ہوا ہے۔ بقول غالب:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

یہ رہے وہ مدافن و مساجد یا بالفاظ دیگر اسلامی فن پارے جن کو میں اپنے قیام کے دوران میں دیکھ پایا۔ تمام مساجد میں قدر مشترک یہ ہے کہ محراب یا تو دیوار کو کھوکھلا کر کے بنایا گیا ہے یا کبھی کبھار ایک گوشے میں جیسے مسجد و مدفن شافعی میں۔ محراب کے قریب منبر ہوتا ہے، اس کی سیڑھیاں تین یا پھر دس بارہ بھی ہو سکتی ہیں۔ محراب کے سامنے

پتھر یا لکڑی کا بنا چبوترہ ہوتا ہے جس پر مبلغ یا مکبر بیٹھتا ہے۔صحن کے وسط میں وضو کے لیے قدیم مسجدوں میں تالاب تھے یا پھران کے ساتھ ساتھ فوارے جہاں ٹونٹیاں لگی ہوتی ہیں۔بعض مساجد میں محراب کو روزانہ مقفل کر دیا جاتا ہے۔

میں قاہرہ میں جس جس دکان پر گیا وہاں زیادہ تر لڑکیوں کو کام کرتے دیکھا۔مسلمان خواتین کی نشانی یہ ہے کہ یہ سر پر سکارف پہنتی ہیں جس سے وہ سر کے بالوں، کانوں اور گلے کو چھپاتی ہیں، اسے ہی وہ حجاب کا نام دیتی ہیں۔ان کے یہاں چہرے کے چھپانے کا کوئی تصور نہیں۔خواتین کا تعلق خواہ وہاں کی دینی تنظیم اخوان المسلمین سے ہو، وہ چہرہ قطعی نہیں چھپاتیں۔

پندرہ دسمبر جمعۃ المبارک کو شام کو ہماری واپسی تھی۔ یہ دن ہم نے ہوٹل میں گزارا، جمعہ کی نماز مسجد میں ادا کی۔ خطیب سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا اور بے ریش تھا۔فقہ شافعی کے علما کی اکثریت کے نزدیک ڈاڑھی لباس کی طرح سنت عادیہ ہے، حلال و حرام سے اس کا قطعی کوئی تعلق نہیں۔ان کے نزدیک ڈاڑھی کے بارے میں روایت سے پتا چلتا ہے کہ جس نے ڈاڑھی رکھنی ہے وہ مہذب اور خوب صورت طریقے سے ڈاڑھی رکھے۔موجودہ دور میں فقہ کے میدان میں امام ابوزہرہ کا بڑا نام ہے، انھوں نے اپنی کتاب ''اصول الفقہ'' میں اسے السنۃ العادیہ قرار دے کر بتایا ہے کہ اس کا تعلق کلچر سے ہے، دین یا شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔لکھتے ہیں:

''کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو لوگ مندوب تصور کرتے ہیں، حالانکہ وہ مذکورہ ان سنتوں (سنت مؤکدہ اور غیر مؤکدہ) سے کم تر ہیں۔رسم و رواج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کا تعلق نہ تو اللہ کے دین سے ہے اور نہ شریعت سے، جیسا کہ آپ کا لباس، کھانا پینا اور ڈاڑھی بڑھانا اور مونچھیں کٹوانا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کے طور پر ان پر عمل کرنا اچھی بات ہے، لیکن ان پر عمل نہ کرنے سے نہ تو انسان عتاب کا مستحق ہوتا ہے اور نہ ندامت و ملامت کا اور جو ان باتوں کو دین کا جز سمجھ کر اختیار کرتا ہے یا اسے لازمی طور پر امر مطلوب تصور کرتا ہے، وہ دین میں بدعت پیدا کرتا ہے۔'' (۳۵)

عبداللہ النواری اپنی کتاب ''سائلونی'' میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک ڈاڑھی مونڈنے کا تعلق ہے، اس کی حیثیت ظاہری شکل و صورت سے ہے۔حلال و حرام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لباس، سر منڈوانے، عقال (رومال کے اوپر باندھنے والا بند) کوفیہ (سر پر لپیٹنے والا رومال) اور عباء کی مانند ہے۔'' (۵۳/۲)

اخوان کے مشہور رہنما اور مفسر قرآن سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ بھی بے ریش تھے۔

شام کو ٹریول ایجنسی کا نمائندہ ہوٹل آیا اور ہمیں لے کر قاہرہ کے ہوائی اڈے کی طرف چل دیا۔ امیگریشن کی کارروائی پوری کر کے وہ ہمیں ڈیپارچر لاؤنج تک چھوڑ کر ہم سے رخصت ہو گیا۔

رات بارہ بج کر پچیس منٹ پر دبئی ائیرپورٹ پہنچے۔ وہاں سے ۳ بج کر ۴۰ منٹ پر روانہ ہو کر سات بج کر ۲۵ منٹ پر لاہور پہنچ گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ دن بخیر و عافیت گزر گئے۔

سیرت النبی

خالد مسعود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر اعتراضات

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین
کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں مکہ کے عوام و خواص کی دلچسپی اور اس سے مرعوبیت کو دیکھتے ہوئے جب قریش کے لیڈروں کو اس دعوت کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے اور ہر گھر میں اس کا چرچا ہونے لگا تو انھوں نے جہاں قرآن کی حیثیت کو مشکوک قرار دینے کی کوشش کی، وہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کی حیثیت کو بھی مشتبہ ثابت کرنے کی سعی کی اور ایسے ایسے نکات پیش کیے جن سے عوام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا جا سکے، یہ حملہ کئی جہتوں سے ہوا۔

بشریت کا طعنہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے خانوادہ بنی ہاشم میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرۂ نسب معلوم و معروف تھا۔ آپ کی پرورش اہل مکہ کی نظروں کے سامنے ہوئی۔ آپ نے تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ مکہ کے تاجروں کے ساتھ آپ کی شراکتیں رہیں اور آپ نے ایک سچے اور امانت دار تاجر کے طور پر نام پیدا کیا۔ آپ نے قریش ہی کے ایک خانوادہ میں شادی کی اور آپ کے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی تمام ضرورتیں وہی تھیں جو معاشرہ کے ہر فرد کی ہوتی ہیں۔ آپ کو دوسرے انسانوں کی طرح زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ جن مسائل سے آپ

دوچار ہوئے، وہ وہی مسائل تھے جو عام انسانوں کو پریشان رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ کی زندگی دوسرے لوگوں سے کسی طرح مختلف نہ تھی۔ لہٰذا قریش کے پاس یہ پروپیگنڈا کرنے کا پورا موقع موجود تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام بشری خصوصیات رکھتے ہیں۔ یہ ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ان کو بازاروں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ یہ بیوی بچوں کے مسائل سے بالکل ہماری طرح دوچار رہتے ہیں۔ ان کو بیماری اور موت کے مراحل سے بھی دوسرے انسانوں کی طرح گزرنا ہے۔ پھر یہ کس برتے پر خدا کا نمائندہ ہونے کے دعوے دار ہیں۔ یہ ہماری مانند صرف ایک بشر ہیں اور نبی و رسول ہونے کا ان کا دعویٰ بالکل بے حقیقت ہے۔

ظاہر ہے کہ محض اس پروپیگنڈے سے قریش کی بات ذہین لوگوں کے دلوں میں جگہ نہ پا سکتی تھی۔ وہ دعواے رسالت کی صداقت کا اطمینان کرنے کے لیے مزید سوالات کرتے تو قریش کے اکابر کو اپنی بات منوانے کے لیے کئی کئی توجیہات کرنا پڑتیں۔ وہ کہتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بطور رکن خاندان اور تاجر اتنی کامیابی حاصل نہیں ہوئی کہ ان کا شمار سادات قریش میں ہوتا، اس لیے انھوں نے دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کی غرض سے ایک ایسا دعویٰ کر دیا ہے جس کی صداقت کو جانچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگر ہم اس دعویٰ سے مرعوب ہو کر اپنے ہی جیسے ایک بشر کو خدا کا نمائندہ سمجھ کر سر پر بٹھا لیں گے تو بلا وجہ اس کے مطیع ہو کر نقصان اٹھائیں گے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے دعواے نبوت کو قریش کے خانوادوں کی باہمی چپقلش کے تناظر میں بھی دیکھا اور بنو امیہ کے ایک لیڈر نے یہ کہا کہ ہم نے بنو ہاشم کا مقابلہ ہر میدان میں کیا اور ان سے ہار نہ مانی۔ اب ان کے ایک فرد نے نبوت کا دعویٰ کر کے ہم پر اپنی فضیلت جمانے کا ارادہ کیا ہے تو کیا ہم ان کے غلام بن کر رہ جائیں!

کبھی قریش عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے اس حقیقت کا انکار کر دیتے کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر پر کوئی وحی نازل کر سکتا ہے۔ وہ کہتے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فرشتے اتر سکتے ہیں تو آخر ہم پر کیوں نہیں اتر سکتے؟ اگر یہ شخص اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو ہم بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہمیں وہی کچھ ملے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اسی طرح کی وحی ہمارے پاس بھی آئے جس طرح کی وحی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوتی ہے۔ اس صورت میں ہمیں کوئی شبہ لاحق نہ ہو گا، ہم وحی پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعواے نبوت کو ہم تسلیم نہیں کر سکتے۔ قریش یہ بھی کہتے کہ ایک بشر اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا، لازم ہے کہ فرشتے یہ فریضہ سرانجام دیں جو ایک نورانی مخلوق اور اللہ کے مقرب ہیں۔ اگر اللہ کو ہماری تعلیم مطلوب ہوتی تو وہ فرشتوں کو ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے درمیان بھیجتا۔ لہٰذا جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعویٰ کو

محض جھوٹ سمجھتے رہیں گے۔

مکہ کے عوام جب قرشی لیڈروں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے بارے میں سوال کرتے جولوگوں کو متاثر کر رہی تھی، پھر وہ انبیا کی تاریخ کے ان واقعات کے بارے میں دریافت کرتے جوقرآن بیان کرتا اور رسول کے جھٹلانے والوں کو ان کے انجام کی خبر دینے کے لیے سناتا تھا تو قریش ان کو تسلی دیتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ پیش کررہے ہیں، یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ یہ محض گزشتہ اقوام کے بے اصل قصے اور ماضی کے افسانے ہیں جن کو خدا کے نام سے پیش کیا جارہا ہے۔ اس میں کسی قدر دخل اہل کتاب کی سازش کو بھی ہے۔ ان میں سے کوئی شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی کتابوں کی معلومات صبح وشام فراہم کرتا ہے اور وہ ان معلومات کو وحی بتا کر پیش کرتے ہیں۔ قریش اسلاف کے ساتھ عوام کی محبت کے جذبہ کو بھی حق کی مخالفت میں بطور حربہ استعمال کرتے۔ وہ کہتے کہ محمد کی تعلیم کا ہمارے بزرگوں کی تعلیم سے کیا مقابلہ ہے۔ اصل علم تو وہی ہے جو ہمارے پاس اسلاف سے منتقل ہو کر آیا ہے۔ یہ شخص تمھیں اپنے معبودوں سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے رسول کا روپ دھار لیا ہے۔ لہٰذا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ محمد سے دور رہیں، اس کی باتوں پر کان نہ دھریں اور اپنے اسلاف کے طور طریقہ اور معبودوں کی پوجا پاٹ پر یکسوئی سے جمے رہیں۔ یہ جو بات کہہ رہا ہے، ہم نے اس دور آخر میں تو سنی نہیں۔ یہ محض ایک من گھڑت بات ہے، اس خیال کے پھیلانے میں حصہ اگرچہ قریش کے متعدد لیڈروں نے لیا لیکن اس میں پیش پیش ان کے دو سردار ابولہب اور ابوجہل تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے۔ آپ جب کسی فرد یا جماعت کو خدا کا پیغام سناتے اور توحید کی تعلیم دیتے تو یہ فوراً آپ کی تقریر کا اثر زائل کرنے کے لیے اسلاف کے حوالہ سے لوگوں کو بتاتے کہ یہ شخص ہمارے معزز ومحترم اسلاف کی شان میں گستاخی کرتا اور ان کو حق سے منحرف سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کی بات کو اہمیت نہ دو۔ ابولہب کی یہ منادی تاریخ کے اوراق میں ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

> ''اے بنو فلاں، یہ شخص تم لوگوں کو اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ تم لات وعزیٰ اور بنو مالک بن اُقیش کے جنوں میں اپنے حلیفوں کا جوا اپنی گردنوں سے اتار کر اس کی لائی ہوئی بدعت وضلالت کو قبول کر لو۔ پس تم نہ اس کی بات سننا، نہ اس کو قبول کرنا۔ (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۱/۴۲۳۔)

ان لوگوں نے اپنے غنڈہ عناصر کو بھی سکھا رکھا تھا کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو اپنی بات سنا رہے ہوں تو شور کر کے اور ہڑبونگ مچا کر اس بات کو ناممکن بنا دیا کرو کہ وہ اپنی بات پورے سکون کے ساتھ کسی کو سمجھا سکیں۔ وہ

عوام کو اپنے موقف کے صحیح ہونے کی تسلی دیتے ہوئے کہتے کہ ہم جن معبودوں کو پوجتے اور ان کے نام پر جن چیزوں کو حلال و حرام ٹھہراتے ہیں، یہ سب خدا ہی کی مرضی سے کرتے ہیں۔ اگر یہ کام غلط ہوتے تو خدا ان کو کیسے گوارا کرتا۔ وہ لازماً اپنی قدرت سے ہمیں ان سے روک دیتا۔ قیامت کے تصور کو وہ محض ایک ڈراوا قرار دیتے اور کہتے کہ جب ہم مر کر مٹی اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو اس کے بعد دوبارہ زندگی پانے اور اٹھائے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ محمد یہ تصور محض اپنے پیرووں کی تعداد بڑھانے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

قریش کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر معترض ہونا بالکل ناروا تھا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام عربوں کے جد امجد تھے۔ قریش ان کے شجرۂ نسب کو جانتے اور اپنا شجرۂ نسب ان تک پہنچانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ دونوں بزرگ شخصیتیں نبوت کے منصب پر فائز تھیں اور انھی کا بتایا ہوا دین تھا کہ جس کے بقایا قریش کو عزیز اور ان کی سیادت کا ایک سبب تھے۔ لہٰذا قریش سے یہ بات مخفی نہیں تھی کہ خدا کے پیغمبر بشر ہی ہوتے ہیں، وہ دوسرے لوگوں کی طرح کھاتے پیتے، شادی بیاہ کرتے، بیوی بچوں میں رہتے اور زندگی کے ان مشاغل میں حصہ لیتے ہیں جن میں دوسرے لوگ حصہ لیتے ہیں۔ قریش انبیاے بنی اسرائیل کے بارے میں بھی معلومات رکھتے تھے کہ یہ سب بشر تھے، ان میں سے کوئی فرشتہ نہ تھا۔ لہٰذا بشریت پیغمبری میں کبھی مانع نہیں ہوئی۔

انبیا کا تعلق کسی دوسری مخلوق سے سمجھنا ایک ناقابل فہم بات تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی تعلیم و اصلاح کے لیے ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا، کیونکہ اس کے جذبات و احساسات، عواطف و ضروریات اور عمومی صلاحیتیں انھی جیسی ہوتی ہیں، ورنہ وہ انسانوں کو نہ ان کے اپنے انداز میں کوئی بات سمجھا سکتا نہ عمل میں ان کے لیے نمونہ پیش کر سکتا۔ ہاں اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے اور ان کی تعلیم مقصود ہوتی تب اللہ تعالیٰ یقیناً فرشتہ ہی کو نبی بناتا، کیونکہ وہی اس کام کے لیے موزوں ترین ہوتا۔ اسی بات کو قرآن نے واضح کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَ هُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا . قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا . (بنی اسرائیل ۱۷: ۹۴-۹۵)

”لوگوں کے پاس جب ہدایت آ گئی تو اس پر ان کے ایمان لانے میں اس کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں بنی کہ انھوں نے یہ کہا کہ اللہ نے ایک بشر کو رسول مبعوث کیا ہے! تم انھیں بتاؤ کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور قیام پذیر ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر اتارتے۔“

فرشتوں کو فرداً فرداً انسانوں کے پاس بھیجنے کا مطالبہ بھی اس لیے ناروا تھا کہ نبوت کا تاج پہننے کے لیے موزوں شخص وہی ہوسکتا ہے جو معاشرے کا صالح ترین انسان، سلامتی طبع اور صفائی قلب کا اعلیٰ نمونہ اور بلند اخلاق و کردار کا عمدہ پیکر ہو۔ ایسا شخص اپنی فطرت کے لحاظ سے وحی کا نور اپنے اندر سمو لینے پر قادر ہوتا ہے جبکہ دنیاداری میں لتھڑے ہوئے لوگ اس لائق نہیں ہوتے کہ وہ فرشتۂ وحی سے کچھ اخذ کرسکیں۔ اسی لیے قرآن نے قریش کے مطالبہ کا یہ جواب دیا کہ ''اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کی ذمہ داری کس کو سونپے''۔

قریش کے اس مطالبہ کے جواب میں کہ آخر فرشتے ہم پر کیوں نہیں اترتے، قرآن نے جہاں یہ وضاحت کی کہ ہر شخص اس کا اہل نہیں کہ اللہ اس کو نبوت کے مقصد کے لیے منتخب کرلے، وہیں ایک مسکت جواب یہ بھی دیا کہ فرشتے کا نزول دوسرے لوگوں پر بھی ہوسکتا ہے، لیکن یہ بندوں کے لیے بے حد خطرناک ہوتا ہے، کیونکہ فرشتے کسی مقصد حق کے ساتھ آتے ہیں اور رسولوں کے جھٹلانے والوں کے معاملہ میں مقصد حق ان کو کیفر کردار تک پہنچانا ہوتا ہے جس کی مثال قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتوں کی آمد کا واقعہ ہے۔ فرمایا:

وَقَالُوۡا يٰۤاَيُّهَا الَّذِىۡ نُزِّلَ عَلَيۡهِ الذِّكۡرُ اِنَّكَ لَمَجۡنُوۡنٌ. لَوۡ مَا تَاۡتِيۡنَا بِالۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ مَا نُنَزِّلُ الۡمَلٰٓـئِكَةَ اِلَّا بِالۡحَـقِّ وَمَا كَانُوۡۤا اِذًا مُّنۡظَرِيۡنَ. اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ. (الحجر ۱۵: ۶-۹)

''یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر یاددہانی اتاری گئی ہے، تم تو ایک خبطی ہو۔ اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے؟ ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے، مگر فیصلہ کے ساتھ اور اس وقت ان کو مہلت نہیں ملے گی۔ یہ یاددہانی ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ بشریت کے اعتراض کا سامنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آپ سے پہلے آنے والے تمام انبیا و رسل کو کرنا پڑا۔ قریش کا یہ موقف نیا نہیں تھا کہ اللہ نے ان کے پاس ایک بشر کو رسول بنا کر کیوں بھیجا۔ ہر دور کے لوگوں کو یہ اشکال پیش آیا اور انھوں نے نبوت و رسالت کے اعلان کو اپنے اوپر پیغمبر کی برتری حاصل کرنے کی کوشش ہی قرار دیا۔ یہ بات قرآن کے حسب ذیل بیان سے واضح ہے:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ. اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ. فَقَالَ الۡمَلَؤُا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُرِيۡدُ اَنۡ

''اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم (اس کے غضب سے) ڈرتے نہیں؟ تو اس

يَّتَفَضَّلَ عَلَيۡكُمۡ. وَلَو شَآءَ اللّٰهُ لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِي اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِيۡنَ.

(المومنون۲۳: ۲۳-۲۴)

کی قوم کے سرداروں نے، جنھوں نے کفر کیا، کہا کہ یہ تو بس تمھارے ہی جیسا ایک بشر ہے۔ یہ تم پر اپنی برتری جمانا چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ رسول ہی بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ اس طرح کی بات ہم نے اپنے اگلے بزرگوں میں تو سنی نہیں۔''

ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا مِنۡ بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِيۡنَ. فَاَرۡسَلۡنَا فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ. اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ. وَقَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ الۡاٰخِرَةِ وَ اَتۡرَفۡنٰهُمۡ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يَاۡكُلُ مِمَّا تَاۡكُلُوۡنَ مِنۡهُ وَ يَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ. وَلَئِنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَكُمۡ اِنَّكُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ. اَيَعِدُكُمۡ اَنَّكُمۡ اِذَا مِتُّمۡ وَكُنۡتُمۡ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمۡ مُّخۡرَجُوۡنَ هَيۡهَاتَ هَيۡهَاتَ لِمَا تُوۡعَدُوۡنَ.

(المومنون۲۳: ۳۱-۳۶)

''پھر ہم نے ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھائے اور ان میں بھی ایک رسول انھی میں سے اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم اس سے ڈرتے نہیں؟ اس کی قوم کے سرداروں نے، جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا، اور ان کو ہم نے دنیا کی زندگی میں خوش حالی دے رکھی تھی، کہا کہ یہ تو بس تمھارے ہی مانند ایک بشر ہے۔ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی بات مان لی تو تم بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے۔ کیا وہ تمھیں اس بات کا ڈراوا دیتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور خاک اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم پھر نکالے جاؤ گے؟ بہت ہی بعید اور نہایت ہی مستبعد ہے یہ ڈراوا جو تمھیں سنایا جا رہا ہے۔''

جہاں تک سابق انبیا کے واقعات کا تعلق ہے تو سچی بات یہ ہے، اور یہ قریش سے بھی مخفی نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بارے میں از خود کوئی معلومات نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے سابق آسمانی صحیفوں میں سے کچھ پڑھا تھا اور نہ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف تھے۔ اس کے باوجود آپ جو کچھ سناتے، وہ پوری صحت کے ساتھ سناتے، بلکہ اس میں اگر اہل کتاب نے کوئی گھپلا کیا ہوتا تو اس کی اصلاح بھی شامل ہوتی، نیز ہر واقعہ میں پنہاں سبق بھی نمایاں ہوتا۔ گویا واقعات محض بطور قصہ نہ سنائے جاتے، بلکہ ان کا اطلاق قریش کے حالات پر کیا جاتا۔

بسا اوقات ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر کے ماضی کے کسی واقعہ کے بارے میں پوچھا گیا تو قرآن میں اس کی پوری وضاحت آ گئی۔ بالفرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی تعلیم دینے والا تھا تو اس طرح کے سوالات کا پورا جواب فی الفور آپ نے کیسے فراہم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ غیب کی یہ خبریں آپ کو بذریعہ وحی دی جاتی تھیں کیونکہ آپ اللہ کے رسول تھے اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ خود ہی آپ کی رہنمائی فرما رہا تھا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے مدین کے قیام اور کوہ طور کے واقعات، زکریا علیہ السلام کے ہاں بیٹے کی ولادت، مریم علیہا السلام کی کفالت کے احوال، یوسف علیہ السلام کی زندگی کی سرگزشت، ذوالقرنین کی فتوحات اور متعدد پیغمبروں کے واقعات قرآن میں مفصل بیان ہوئے، یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائیں، حالانکہ اس سے پہلے یہ آپ کے علم و اطلاع سے باہر کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایسے واقعات کو بیان کرنے کے بعد یہ وضاحت کر دی کہ:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا. (ہود ۱۱: ۴۹)	''یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے سنا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمھاری قوم کے لوگ ہی۔''

اسی طرح اسلاف کی تعلیم، جس پر قریش کو ناز تھا اور جس کے مقابلہ میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو نظر انداز کیے ہوئے تھے، معلوم تاریخی حقائق کی روشنی میں وہ نہیں تھی جو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے ان کی نسل کو منتقل ہوئی تھی۔ اس میں سب سے بڑی نقب عمرو بن لحی خزرجی نے لگائی جب اس نے خانہ کعبہ میں بت داخل کیے۔ بعد میں بیت اللہ کے منتظمین نے اس شرک کی سرپرستی کی اور بدعات پر مبنی ایک پوری شریعت رائج کر دی۔ بدعات پر مبنی اسی مذہب کے خلاف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سچے پیرو حنفا ہمیشہ احتجاج کرتے رہے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک اپنا وجود باقی رکھا۔ قریش کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی اخلاقی تعلیم سے عناد نہ تھا، لیکن جب مشرکانہ نظام پر زد پڑتی تو ان کے مفادات آڑے آ جاتے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے۔

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر اعتراض کرنے کی قریش کے پاس کوئی واقعی بنیاد نہ تھی۔ اس حوالہ سے انھوں نے جو باتیں بنائیں، وہ عقل اور حقائق کی روشنی میں بالکل غلط تھیں۔

دنیاوی خوش حالی نہ ملنے کا طعنہ

قریش یہ بات بھی کہتے کہ اگر خدا نے ایک انسان ہی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا تو یہ کیوں نہ ہوا کہ اس کی دنیاوی

حالت میں ایسی تبدیلیاں کر دی جاتیں جو اس کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کر دیتیں اور وہ عرب کے سرداروں کے سامنے بہتر اسباب حیات کے ساتھ گردن تان کر کھڑا ہو سکتا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تو خوش حالی تک بھی حاصل نہیں جبکہ مکہ اور طائف دونوں بستیوں کے اشراف میں متعدد لیڈر ایسے ہیں جو معاشی آسودگی اور اپنی بھاری شخصیت کی بنا پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فوقیت رکھتے ہیں۔ یہ لیڈر اس لائق تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں میں بھی کوئی بڑی شخصیت نہیں۔ کچھ بے سمجھ نوجوان اور لونڈی غلام ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ کوئی عاقل و فرزانہ لیڈر ان کے دام میں نہیں پھنسا۔ گویا ان کی تعلیم صرف ان لوگوں کو متاثر کر سکی ہے، جن کی ذہنی سطح اونچی نہیں اور جو سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہیں۔

قریش کے کچھ مطالبات ایسے تھے جو اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے جاتے۔ مثلاً یہ کہ آپ اگر فی الواقع خدا کے نمائندہ ہیں تو ہمارے لیے اس سنگلاخ زمین میں پانی کا ایک چشمہ ہی جاری کر دیں۔ یا اپنے لیے ہی ایک نخلستان اور تاکستان حاصل کر لیں جس کے بیچوں بیچ پانی کی نالیاں ہوں جو اس باغ کو سیراب کریں۔ یہ باغ آپ کی خوشحالی کا ذریعہ بنے اور خدا کی نگاہ میں آپ کے معزز و مکرم ہونے کا ثبوت ہو۔ یا قیام کے لیے خدا سونے کا ایک محل بنا دے جو آپ کی امارت کا منہ بولتا ثبوت ہو۔ قریش اس بات کی توقع بھی رکھتے کہ اللہ کے رسول کی حیثیت سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کچھ غیر معمولی کام ان کے اطمینان کے لیے کر کے دکھانے چاہئیں۔ مثلاً اس بات کے ثبوت کے لیے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں، وہ اللہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے، ایسا کیوں نہیں ہو جاتا کہ آسمان کے کچھ ٹکڑے ہم پر گر پڑیں۔ یا خدا اور اس کے فرشتے ہمارے بالمقابل نمودار ہو جائیں۔ یا آپ ہماری نظروں کے سامنے آسمان کی طرف چڑھ جائیں اور وہاں سے وحی لکھوا کر لائیں جس کو ہم خود پڑھ سکیں۔ ان میں سے کوئی ثبوت مہیا ہو جائے تو ہم آپ کو خدا کا سچا پیغمبر مان لیں گے۔ قریش کا خیال یہ تھا کہ جب ہم دنیاوی اسباب و وسائل کے اعتبار سے مسلمانوں سے بہتر ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کی نگاہوں میں بھی ہم ان سے بہتر ہیں۔ اگر ہم خدا کے مبغوض ہوتے تو وہ ہمیں عیش کرنے کے لیے نہ چھوڑ دیتا۔

اسی طرح قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووں کو حقیر جانتے۔ اسی لیے ان کے اکابر ان کے برابر بیٹھنے میں اپنی سبکی سمجھتے اور صاف کہہ دیتے کہ ہم آپ کی بات اس وقت سنیں گے جب آپ ان لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیں۔ روایات میں آتا ہے کہ قریش ان غریب مسلمانوں کا بہت مذاق اڑاتے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ان کی تذلیل کی جاتی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی رفاقت پر طعنے دیے جاتے۔ اس طرح کی صورت حال

میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشانی لاحق ہوتی کہ وہ ایسے خودسر سرداروں کے معاملہ میں کیا رویہ اختیار کریں اور حق تبلیغ کس طرح ادا کریں۔

جب آخرت کے انجام کا بیان ہوتا اور اس میں پیغمبر کی دعوت کو جھٹلانے والوں کو ملنے والی سزاؤں کا ذکر ہوتا تو سادات قریش کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہ ہوتے کہ پیغمبر کے نادار اور مفلوک الحال ساتھی تو جنت کی نعمتوں اور آسایشوں سے نوازے جائیں گے اور قریش کے کئی پشتوں سے سردار جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ ایسے بیانات پر وہ مشتعل ہو جاتے تو ٹولیاں بنا بنا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھیں دکھاتے تاکہ آپ ان کے طیش و غضب سے مرعوب ہو کر اپنا مشن چھوڑ جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مادی لحاظ سے کوئی غیر معمولی امتیازی سلوک نہ ہونے پر اور آپ کے صحابہ کی بے سروسامانی پر قریش کے اعتراضات معقول نہیں کہے جا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی لحاظ سے آسودگی یا بے سروسامانی اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے ہدایت پانے یا نہ پانے کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ یہ دو مختلف احوال ہیں۔ ایک آدمی معاشی طور پر آسودہ ہے تو یہ بات اس کے اخلاق و کردار کے افضل ہونے کی ضمانت نہیں ہو سکتی، بلکہ دیکھا گیا ہے کہ ایسا آدمی کردار کی ایسی خامیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جن میں کم وسائل رکھنے والے لوگ مبتلا نہیں ہوتے۔ ہدایت تو رب کا فضل ہے۔ جو اس کا طالب بنتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ اسباب معیشت کی فراوانی ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اللہ کے ہاں یہ کسی کے منظور نظر ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ قرآن میں اس کا ذکر نہایت حقارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ. اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ. نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا. وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ. وَلَوْ لَاۤ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا

”اور انھوں نے اعتراض اٹھایا کہ یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کے فضل کو یہی تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کا سامان تو ہم نے تقسیم کیا ہے اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے ہیں تاکہ وہ باہم دگر ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو جو لوگ خدائے رحمان کے منکر

يَظۡهَرُوۡنَ . وَلِبُيُوۡتِهِمۡ اَبۡوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيۡهَا يَتَّكِئُوۡنَ . وَ زُخۡرُفًا . وَ اِنۡ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا. وَالۡاٰخِرَةُ عِنۡدَ رَبِّكَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ. (الزخرف۴۳:۳۱-۳۵)

ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی چاندی کے، جن پر وہ چڑھتے۔ اوران کے گھروں کے کواڑ اوران کے تخت بھی چاندی کے، جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ اور یہ چیزیں سونے کی بھی کر دیتے۔ اور یہ چیزیں تو بس دنیا کی زندگی کی متاع ہیں اور آخرت تیرے رب کے پاس متقیوں کے لیے ہے۔''

بشریت کے اعتراض کی طرح نبی کے ساتھیوں پر طعنہ زنی بھی ہمیشہ سے کفار کا وطیرہ رہی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں قرآن کا بیان ہے:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ اِنِّىۡ لَـكُمۡ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ . اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ . اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ اَلِيۡمٍ . فَقَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ مَا نَرٰكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاۡىِ وَمَا نَرٰى لَـكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۢ بَلۡ نَظُنُّكُمۡ كٰذِبِيۡنَ.

(ہود ۱۱:۲۵-۲۷)

''اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ (اس نے ان کو آگاہ کیا کہ) میں تمھارے لیے ایک کھلا ڈرانے والا ہو کر آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ تو اس کی قوم کے ان سربراہوں نے، جنھوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو بس اپنے ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور ہم تمھاری پیروی کرنے والوں میں انھی کو پاتے ہیں جو ہمارے اندر کے ذلیل لوگ بے سمجھے بوجھے تمھارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اور ہم تم لوگوں کے لیے اپنے مقابل میں کوئی خاص امتیاز بھی نہیں دیکھ رہے ہیں، بلکہ ہم تم کو بالکل جھوٹا خیال کر رہے ہیں۔''

اس اعتبار سے گویا قریش کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رویہ وہی تھا جو ماضی کے کفار نے ہر زمانہ میں اپنے انبیا کے ساتھ روا رکھا تھا۔ چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض ہوتا کہ آپ کوئی فوق الفطری خصوصیات کا مظاہرہ کریں تا کہ ہمارا اشکال رفع ہو تو آپ فرماتے کہ کامل اختیار میرا رب رکھتا ہے۔ میں تو تمھاری مانند ایک بشر ہوں، البتہ مجھے رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ مجھے اگر جانچنا ہے تو میری اس حیثیت کے لحاظ سے جانچو۔ تم

مجھے زچ کرنے کے لیے جونت نئے مطالبات کر رہے ہو، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ. (الانعام ٦: ٥٠)

''(اے پیغمبر)، تم کہہ دو کہ میں تمھارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا، اور نہ تمھارے سامنے یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔''

شاعر، کاہن، ساحر، مسحور اور مجنون ہونے کا الزام

کسی آدمی کے اصل منصب سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک کارگر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے مشن کو کوئی ایسا رنگ دے دیا جائے جو لوگوں کی نگاہوں میں اس کو بے وقعت بنا دے۔ یہ حربہ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں استعمال کیا۔ چونکہ آپ کے پاس پیش کرنے کی اصل چیز قرآن تھا جسے آپ لوگوں کو سناتے اور اپنی رسول ہونے کی حیثیت کو نمایاں کرتے، اس لیے سادات قریش نے آپ کو کبھی شاعر و کاہن ہونے کا الزام دیا، کبھی یہ کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے جو اپنے جادو کے زور سے معاشرہ میں تفریق پیدا کر رہا ہے، کبھی کہتے کہ یہ پہلے تو چنگا بھلا تھا، اب معلوم ہوتا ہے کسی نے اس پر جادو کا عمل کر دیا ہے، جس کے باعث مخبوط الحواس ہو کر یہ عجیب عجیب باتیں کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہہ کر وہ یہ توقع رکھتے کہ زمانہ خود ہی اس شخص اور اس کے کلام کو ختم کر دے گا۔ اس کی شہرت چند روزہ ہے۔ اگر جنون کے اثر کے تحت وہ ہمیں کچھ ڈراوے دے رہا ہے تو ان کو سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس کی بہکی بہکی باتیں ہیں جن کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ کلام پر اعتراضات کا تعلق ہے، ان پر سیر حاصل بحث پچھلے باب میں ہو چکی ہے۔ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت عرفی کو داغ دار کرنے کی کوشش کی گئی تو خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخالفین کے تمام الزامات سے بری کیا۔ فرمایا کہ ہمارے یہ رسول تمھارے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں، یہ تمھارے اندر پیدا ہوئے۔ تمھارے ساتھ رہے سہے۔ ان کی زندگی کا ہر دور بچپن سے جوانی تک تمھارے اندر گزرا۔ تم میں سے ہر شخص ان کے خلق عظیم کا معترف اور ان کی شرافت، صداقت، امانت، دیانت اور عفت و پاکیزگی کا گواہ ہے۔ چالیس برس کی عمر تک تم نے ان پر ہمیشہ اعتماد کیا، لیکن جب سے اللہ تعالیٰ نے ان

کے دل پر اپنی تعلیم نازل فرمائی ہے تم پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گئے ہو اور ان کے سابق کردار کو بالکل بھلا بیٹھے ہو جبکہ نہ ان کے مشاہدات میں کسی جھوٹ اور فریب نفس کو دخل ہے اور نہ وحی کا القا کوئی واہمہ ہے۔ یہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں، اس میں غیب دانی کی کوئی نمائش نہیں اور نہ یہ پیسا بٹورنے کا ذریعہ ہے۔ کیا تم اس کلام کے اثر کو نہیں دیکھتے کہ اللہ اپنے ان کلمات کے ذریعہ سے باطل کو مٹا کر حق کا اثبات کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام شیطان کے کرنے کا نہیں ہے۔ دنیا میں آج تک کسی جھوٹے اور جعل ساز نے اس طرح کا فیض بخش اور روح و قلب کو منور کرنے والا کلام پیش نہیں کیا جس طرح کا کلام یہ قرآن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قریش کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار پر حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی اور نہ وہ دلیلوں سے کسی کو آپ کے خلاف قائل کر سکتے تھے۔ اسی لیے وہ عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے قسمیں کھا کھا کر ان کو مطمئن کرتے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے اندر وسوسے اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے بھی کوشاں رہتے تاکہ ان میں پھوٹ پڑ جائے اور ان کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدگمانیاں پیدا کی جاسکیں۔

کفار کے اس الزام کے جواب میں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنا کلام خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس طرح لوگوں پر دھونس جماتے ہیں، قرآن نے ایک اہم حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اللہ کے رسول خدا کی نہایت کڑی نگرانی میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ جس طرح فرشتۂ وحی سے کوئی جن یا کوئی شیطانی قوت وحی کا خزانہ چھین نہیں سکتی اور وہ بالکل خالص اور بے آمیز شکل میں اللہ کے رسول کے حوالہ ہوتا ہے، اسی طرح رسول کے پاس وہ خالص اور بے آمیز شکل میں اس طرح رکھا جاتا ہے کہ خود رسول کی بھی مجال نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جی سے اس میں کوئی ردوبدل کر دے۔ اگر خدانخواستہ کوئی رسول ایسا کرنے کی جسارت کرے تو اللہ کی سنت یہ ہے کہ 'ہم اس کو اپنے قوی بازو سے پکڑیں گے اور اس کی شاہ رگ ہی کاٹ ڈالیں گے۔ پھر کوئی بھی اس کو ہم سے بچانے والا نہیں بن سکتا'۔

قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان بھی فرمایا کہ تم قریش پر یہ بات واضح کر دو کہ اگر میں گمراہ ہوں اور تم اس بنا پر میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو تو میں اپنی گمراہی کا خمیازہ خود بھگتوں گا اور تم اس کے وبال سے محفوظ رہو گے۔ لیکن اگر میں ہدایت پر ہوں اور یہ ہدایت میرے پاس اپنے رب کی طرف سے نازل ہو رہی ہے تو اس صورت میں تم وحی الٰہی کے جھٹلانے والے ٹھہرو گے اور اس جرم کا انجام کوئی سہل چیز نہیں ہوگا۔ اس لیے میرے معاملہ میں اچھی طرح غور کر کے کوئی فیصلہ کرو۔

قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی بھی دی کہ وحی تم نے اپنی خواہش سے نہیں پائی اور نہ اسے اپنی

خواہش سے پا سکتے ہو۔ جس ذات نے یہ چشمۂ فیض جاری کیا ہے، وہی اس کو رواں بھی رکھ سکتا ہے اور اس کو روکنے پر بھی قادر ہے۔ اگر اس نے یہ امانت تمھارے سپرد کی ہے تو وہ اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق بھی عطا کرے گا اور دشمنوں کی سازشوں سے بھی محفوظ رکھے گا۔ بس تم صبر و استقامت سے اپنا کام کیے جاؤ اور دشمنوں کی چالوں کو خاطر میں نہ لاؤ، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ کافی ہے۔ بہت جلد یہ اپنا انجام دیکھ لیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیش کردہ کلام کو عوام الناس کی نظروں سے گرانے کے لیے قریشی سرداروں نے جتنے جتن بھی کیے، وہ سب رائیگاں گئے۔ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت کو داغ دار کیا جا سکا اور نہ آپ کے کلام ہی سے متعلق بدگمانیاں پھیلا کر اس سے لوگوں کو متنفر کیا جا سکا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور قریش کے ہر خانوادے میں مسلم و کافر کی تقسیم واضح نظر آنے لگی۔ اس صورت حال میں قریش اکابر کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا کہ وہ مسلمان ہونے والوں پر مزید ظلم کریں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بھی نشانہ بنائیں، قرآن سننے سنانے کو ایک مشکل کام بنا دیں اور دہشت پھیلا کر نئے دین کی دعوت کی راہ میں روڑے اٹکائیں۔

(جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی ﷺ'' سے انتخاب)

محمد وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین
کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

—— ۱۰ ——

سیرت و عہد

عہد فاروقی میں سر کی جانے والی شمالی ایران کی مہمات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسی عرصے میں سیدنا عمر کے مقرر کردہ سالار اصطخر حضرت عثمان بن ابو العاص کی فوج نے بحری جہازوں کے ذریعے سے خلیج فارس کو عبور کیا اور جزیرۂ ایز کاوان پر قبضہ کر لیا۔ پھر حضرت عثمان نے توّج پہنچ کر اسے گھیرے میں لے لیا۔ مجاشع بن مسعود ان سے پہلے بصرہ کی جانب سے آ کر محاصرہ کیے بیٹھے تھے۔ اہل توّج کو علاء بن حضرمی کی یورش روکنے کا تجربہ تھا، اسی غرے میں انھوں نے دہرے محاصرے کو طول دیا۔ ایک سخت لڑائی میں ان کے بے شمار جنگ جو مارے گئے تو یہ شہر مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ مجاشع یہاں سے سابور اور اردشیر روانہ ہوئے اور ان دونوں شہروں کو فتح کیا۔ حضرت عثمان بن ابو العاص نے اپنا لشکر لے کر ایران کے قدیم دار الحکومت اصطخر کا رخ کیا۔ ہر بز نے اپنے مقدس شہر کا دفاع کرنے کے لیے تمام قوتیں جمع کر لیں، جہاں مجوسیوں کے دیوتا اناہید کا آتش کدہ اور ساسانی بادشاہوں کے مقبرے تھے۔ وہ فوج لے کر شہر سے باہر جور کے قصبے تک آیا، جیش عثمان نے غلبہ پایا تو بھاگ کر شہر میں واپس چلا گیا اور قلعہ بند ہو گیا۔ محاصرہ طویل ہونے پر شہر والے عاجز آ گئے اور انھوں نے دروازے کھول دیے۔ کچھ قتل و غارت اور لوٹ مار ہوئی، شہری

فرار بھی ہوئے، لیکن حضرت عثمان نے انھیں جزیہ دینے پر راضی کر لیا، ہربز بھی لوٹ آیا۔ حضرت عثمان کو جب پتا چلا کہ کچھ فوجیوں نے مال غنیمت تقسیم ہونے سے قبل ہی اس پر قبضہ کر لیا ہے تو کھڑے ہو کر خطبہ دیا: دین میں سب سے پہلے امانت کا فقدان ہوتا ہے، اس کے ضائع ہو جانے کے بعد روز بروز کچھ نہ کچھ کھویا رہتا ہے۔ تمام مال اپنی تحویل میں لے کر انھوں نے فوجیوں کے حصے بانٹے اور خمس مدینہ ارسال کر دیا۔ حضرت عمر نے ان کی کارکردگی سے خوش ہو کر انھیں بحرین کا گورنر مقرر کر دیا۔

اصطخر ایک شان دار ماضی رکھتا تھا، اس شہر کو سیاسی و مذہبی تفوق حاصل تھا۔ وہاں کے باشندگان کو اپنی کھوئی ہوئی حیثیت رہ رہ کر یاد آتی تھی، اس لیے شاہ کرمان شہرک کے اکسانے پر جلد ہی بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے حضرت عثمان بن ابوالعاص سے کیا ہوا معاہدہ توڑا اور شہرک کے جھنڈے تلے جمع ہو کر توّج شہر میں قلعہ بند ہو گئے۔ شہرک نے سابور، اردشیر اور دوسرے شہروں پر غارت گری کر کے کافی ساز و سامان اکٹھا کر لیا تھا۔ حضرت عثمان کے بھائی حکم بن عاص کو اس کی سرکوبی کی ذمہ داری ملی۔ کئی روز جاری رہنے والی سخت جنگ میں شہرک کے لشکر کو شکست ہوئی، خود وہ اور اس کا بیٹا بھی مارے گئے۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان کے زمانے میں بھی اہل اصطخر نے عہد شکنی کی، تاہم تجدید صلح کرنے پر مجبور ہوئے۔ بلاذری کے کہنے کے مطابق اس مرحلے پر حضرت عمر کے فرمان پر ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عثمان سے آ ملے اور ان دونوں نے ارّجان، شیراز اور سینیز کے مقامات فتح کیے۔ پھر حضرت عثمان نے درابجرد اور فسا شہروں کے رہنے والوں سے معاہدات صلح کیے۔ طبری کے خیال میں درابجرد اور فسا کے شہر ساریہ بن زنیم نے فتح کیے۔ وہ ان شہروں کا محاصرہ کیے بیٹھے تھے کہ ایرانیوں کو کمک آن پہنچی۔ اسی رات عمر رضی اللہ عنہ نے خواب میں اسلامی فوج کی پوزیشن ملاحظہ کی۔ انھوں نے دیکھا کہ اگر فوج صحرا میں بیٹھی رہی تو ایرانیوں اور کردوں کے گھیرے میں آ جائے گی اور اگر اس نے پہاڑ کو پیچھے رکھ کر اپنی صف بندی کر لی تو محض ایک جانب سے ہونے والے حملے کو روکنا ہو گا۔ انھوں نے نماز کے بعد خطبہ دیا اور لوگوں کو اس بات کی اطلاع دی۔ دوران خطبہ میں وہ چلائے: اے ساریہ بن زُنیم، پہاڑ کی جانب ہو جاؤ۔ پھر کہا: اللہ کی فوجیں بے شمار ہیں، ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی یہ بات وہاں تک پہنچا دے۔ عین اسی وقت ساریہ دامن کوہ میں آ گئے۔ اسلامی فوج اپنی پشت محفوظ ہونے کی وجہ سے بے جگری سے لڑی اور ایرانیوں کو شکست سے دوچار کیا۔ مال غنیمت میں جواہرات سے بھرا ایک صندوق ملا جسے ساریہ نے فتح کی خوش خبری کے ساتھ حضرت عمر کی خدمت میں بھیج دیا۔ انھوں نے وہ صندوق فوجیوں میں تقسیم کرنے کے لیے واپس بھیج دیا۔ روایت ہے کہ اہل مدینہ نے ساریہ کے ایلچی سے دریافت کیا کہ کیا انھوں نے جنگ

کے دن حضرت عمر کی بات سنی تھی؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، ہم نے 'یا ساریۃ ،الجبل ،الجبل' (اے ساریہ، پہاڑ کو ہو جاؤ، پہاڑ کو ڈھال بنا لو) کے الفاظ سنے تھے۔

حضرت عثمان بن ابوالعاص اپنی مہمات میں مصروف تھے کہ حکم بن عمرو تغلبی نے مکران فتح کیا۔ انھوں نے مال غنیمت کے ساتھ ہاتھی بھی مدینہ بھیج دیے۔ امیر المومنین نے ہاتھی بیچ کر ان کی قیمت غازیوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ ادھر حضرت سہیل بن عدی نے کرمان کو زیر کیا، ان کے حملے کے وقت یزدگرد وہیں تھا، اس نے بھاگ کر خراسان کی راہ لی۔ اسے وہاں جائے قرار ملنے کی امید تھی، کیونکہ خراسان و سجستان بصرہ و کوفہ سے کافی مسافت پر تھے اور ابھی وہاں جنگ کی آگ نہ بھڑکی تھی۔ اس کی توقع پوری نہ ہوئی، یہ دونوں صوبے بھی خلافت اسلامیہ کی عمل داری میں آ کر رہے۔ سجستان کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ کمانڈر عاصم بن عمرو سجستان پہنچے تو وہاں کے باشندے اپنے دارالخلافہ بزرنگ میں قلعہ بند ہو گئے۔ جب محاصرہ تنگ ہوا تو اس شرط پر صلح کر لی کہ ان کی کھیتیاں انھی کے پاس رہنے دی جائیں۔

سالار خراسان احنف بن قیس طبسین کے راستے سے خراسان پہنچے تو یزدگرد مروشاہجان میں تھا۔ کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر وہ ہرات پہنچے اور بے شمار قلعوں اور اونچی فصیلوں والے اس شہر کو فتح کیا۔ وہاں کچھ فوج چھوڑ کر وہ نیشاپور اور سرخس کی جانب بڑھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ مروشاہجان جا کر یزدگرد کو گرفتار کیا جائے، لیکن وہ بھنک پا کر قریبی شہر مرورود نکل گیا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو شاہ نے بلخ کا رخ کیا۔ احنف نے بلخ پر قبضہ کر کے حضرت ربعی بن عامر کو وہاں کا عامل مقرر کیا۔ اب یزدگرد ایران کے سرحدی دریا کو عبور کر کے سمرقند جا پہنچا، اس نے خاقان ترک (شاہ تاتار) سے مدد طلب کی۔ خاقان نے خیال کیا کہ مسلمانوں کا ایران پر قبضہ کرنے کے بعد اس پر حملے کا ارادہ ہے، اس نے ایک بڑی فوج ترتیب دی اور اسلامی فوج کا مقابلہ کرنے مرورود تک چلا آیا۔ امیر المومنین عمر بن خطاب تک احنف کی کامیابیوں کی اطلاع پہنچی تو انھوں نے ان کو سرحدی دریا عبور کرنے سے منع کر دیا، کیونکہ وہ تاتاریوں (ترکوں) اور منگولوں کے ساتھ کوئی جنگ چھیڑنا نہیں چاہتے تھے۔ احنف نے اپنی فوج مرورود کی پہاڑیوں کے سامنے لا کھڑی کی، دریائے مرورود تاتاری فوج اور ان کے بیچ حائل تھا۔ کئی دن دونوں لشکر آمنے سامنے پڑے رہے، مسلمانوں نے جنگ کی ابتدا کی نہ دریا عبور کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں ترکوں کی طرف سے مبارزت کرنے والے تین سوار احنف کے ہاتھوں مارے گئے۔ جب خاقان کو یقین ہو گیا کہ مسلمان اس سے بھڑنا نہیں چاہتے تو واپس اپنی سرزمین کو لوٹ گیا۔

مروشاہجان کے محاصرے کے دوران میں یزدگرد چھپایا ہوا خزانہ سمیٹ کر اپنے خاص مصاحبوں کے ساتھ پڑوسی ملک ترکستان یا چین کو فرار ہو رہا تھا کہ اس کی رعایا اس پر پل پڑی اور خزانہ اس سے چھین لیا۔ جب احنف سے ان کی صلح ہوئی تو انھوں نے یہ خزانہ ان کے حوالے کر دیا۔ خمس مدینہ بھیجے جانے کے بعد ہر سپاہی کو اس قدر وافر حصہ ملا جو جنگ قادسیہ میں ملنے والی غنیمت کے برابر تھا۔ غنائم تقسیم کرنے کے بعد عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا: اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایرانیوں کی سرزمین اور ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا ہے، کیونکہ وہ جانچنا چاہتا ہے کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو۔

۱۶ھ میں بیت المقدس کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن عاص برابر سیدنا عمر بن خطاب کو مشورہ دیتے رہے کہ مصر زیر کرنے کا یہ بہترین موقع ہے، کیونکہ وہاں کے لوگوں میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف بازنطینی حکمران ہرقل (Heraclius) نے ان پر سیاسی تسلط جمایا ہوا ہے، دوسری جانب اسی کے حکم سے عیسائی کیتھولک پیشوا کائرس (Cyrus) مصریوں کا عقیدہ بدلنے کے لیے ان پر جبر و تعذیب کے پہاڑ ڈھا رہا ہے۔ ۶۲۹ء میں ہرقل جب مصر آیا تو اس نے کائرس (Cyrus) کو ذمہ داری دی کہ وہ مصر میں Monophysitism (حضرت عیسیٰؑ کا واحد الوہی فطرت رکھنا) کے عقیدے کو فروغ دے۔ وہاں کے عیسائی Miaphysitism (حضرت عیسیٰؑ کی ذات کا ایک ہی وقت میں بشری اور الوہی فطرتوں سے مرکب ہونا) کو مانتے تھے۔ جابیہ میں ابن عاص سے ملاقات کے بعد حضرت عمر مدینہ واپس چلے گئے، پھر اسی زمانے میں خلافت اسلامیہ میں قحط پڑا اور طاعون کی وبا پھیل گئی، اس لیے ان کی تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ ۱۸ھ (۶۳۹ء) میں عمرو بن عاص قیساریہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ انھیں مصر میں آگے بڑھنے کی اجازت مل گئی۔ حضرت عمر نے اہل رائے سے مشورہ کرنے کے بعد لکھا تھا کہ انھی لوگوں کو اس مہم میں شامل کرنا جو اپنی مرضی سے شامل ہونا چاہیں۔ حضرت عمرو معاویہ کو قیساریہ میں نائب مقرر کر کے ۴ ہزار فوج لے کر چل پڑے اور ساتھ ہی مدینہ سے کمک طلب کی۔ اسی اثنا میں وہاں وہ صحابہ سرگرم ہو چکے تھے جو اس مہم کو نوزائیدہ اسلامی مملکت کے لیے پرخطر سمجھتے تھے۔ سیدنا عثمان ان میں پیش پیش تھے، وہ حضرت عمرو بن عاص پر ذاتی اعتراضات بھی کرتے تھے۔ ان کے اصرار پر حضرت عمر نے دوسرا خط لکھا کہ اگر تم مصر میں داخل ہو چکے ہو تو اپنی منزل تک بڑھتے جاؤ اور اگر وہاں نہیں پہنچ پائے تو واپس لوٹ جاؤ۔ وہ رفح اور عریش کے مابین ایک مصری قصبے میں داخل ہو چکے تھے، اس لیے پیش قدمی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ انھیں کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا، کیونکہ مصر کے رومی حکمران مقوقس کی پلاننگ تھی کہ یہ قلیل التعداد لشکر اتنی دور چلا جائے جہاں اس تک مدد آنا ممکن نہ ہو۔ حضرت عمرو بن عاص ۱۰۰ کلومیٹر

سے زیادہ فاصلہ طے کر کے فرما آن پہنچے جہاں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اہل شہر نے دروازے بند کر لیے اور حضرت عمرو نے محاصرہ ڈال دیا، انھیں اپنی فتح کا پورا یقین تھا۔ مشہور روایت ہے، یہ محاصرہ ایک ماہ جاری رہا، کچھ ابتدائی جھڑپوں کے بعد حضرت عمرو کو شان دار فتح حاصل ہوئی۔ مقریزی اور دوسرے مورخین کا خیال ہے کہ یہ کامیابی فرما کے قبطیوں کے مرہون منت تھی، لیکن حقیقت میں ان کی مدد اتنی ہی تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو شہر کے بارے میں معلومات مہیا کیں۔ دوسری وجہ یہ رہی کہ اہل فرما کو مصر کے بادشاہ مقوقس کی جانب سے کوئی کمک نہ پہنچی۔ حضرت عمرو نے قلعہ مسمار کرا دیا اور قریبی بندرگاہ میں کھڑے جہاز جلا ڈالے تاکہ مصریوں کو مزید کارروائی کا موقع نہ ملے۔ فتح کے بعد کچھ مقامی بدوان کی فوج میں شامل ہو گئے۔ اب وہ ایک لمبا سفر طے کر کے بلبیس کے شہر پہنچے جہاں وہ ایک ماہ مقیم رہے۔ اس دوران میں مقوقس نے انھیں لوٹ جانے کی پیش کش کی۔ عمرو نے جواب دیا: ہم تمھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں، دوسری صورت میں تم جانتے ہو، کہ ہم ہی غالب آئیں گے۔ رومی جرنیل اطربون (Tribunus) نے مقابلہ کرنے کی ٹھانی، وہ ۱۲ ہزار کی فوج لے کر نکلا اور راتوں رات مسلم فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ حضرت عمرو تیار تھے، شدید جنگ کے بعد اطربون مارا گیا اور ۱ ہزار جانوں کا نذرانہ دے کر اس کی فوج بھی تتر بتر ہو گئی۔

ابھی مدینہ کی طرف سے کمک کی آمد نہ ہوئی تھی، حضرت عمرو صحرا کے کنارے چلتے چلتے ام دنین تک آ گئے۔ دریائے نیل پر واقع اس قصبے کے جنوب میں مصر کے دو قدیم شہر بابلیون اور منف تھے۔ حضرت عمرو بن عاص نے امیر المومنین کو مدد بھیجنے کے لیے دوبارہ خط لکھا اور سپاہیوں کو امید دلائی کہ کمک آیا چاہتی ہے۔ سب سے پہلے ام دنین کے قلعے کے پہرے داروں نے مسلم فوج آتے ہوئے دیکھی تو مرعوب ہو گئے۔ مدد آئی تو حضرت عمرو نے پوری فوج یکجا کر کے ایک ہلہ بولا اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اب انھوں نے کشتیوں پر دریائے نیل کو عبور کیا، جیزہ کے اہرام کے پاس سے گزرتے ہوئے صحرا میں مارچ کرنا شروع کر دیا، ان کا رخ فیوم کی طرف تھا۔ انھیں مقامی بدووں نے خبر دی کہ حنّا نام کا ایک سالار کھجوروں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں اپنا دستہ چھپاتے چھپاتے ان کی طرف آ رہا ہے۔ حضرت عمرو نے رخ بدلا اور ایک چکر کاٹ کر اس دستے پر حملہ کیا اور اسے ملیا میٹ کر دیا۔ اہل فیوم حنّا کے انجام سے بہت رنجیدہ ہوئے، وہاں کے رومی حکمران نے اس کی لاش حنوط کر کے ہرقل کے پاس قسطنطنیہ بھیج دی۔ ہرقل نے حضرت عمرو کی فوج کچلنے کے لیے ایک مقامی لشکر بھیجنے کا حکم دیا، لیکن حضرت عمرو صحرا سے باہر نہ نکلے تو وہ لشکر لوٹ گیا۔

اسی اثنا میں حضرت عمرو بن عاص کو اطلاع ملی، امیر المومنین نے ان کی طرف مزید کمک روانہ کی ہے جو فرما اور بلبیس کے اسی راستے سے بابلیون کے قلعوں تک پہنچے گی جہاں سے وہ خود آئے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر اس فوج کا

استقبال کرنا چاہتے تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ رومی اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں گے۔ ان کو دریاے نیل عبور کرنا تھا، فیوم سے آنے والی رومی فوج بھی راستے میں حائل تھی۔ مورخین حیران ہیں انھوں نے نیل کیسے پار کیا، فیومی لشکر کو کیسے چکمہ دیا اور عین شمس (Heliopolis) پہنچ گئے۔ ۸ ہزار نفوس پر مشتمل اس فوج میں حضرت زبیر بن عوام، عبادہ بن صامت، مقداد بن اسود اور مسلمہ بن مخلد جیسے جلیل القدر صحابہ موجود تھے۔ سیدنا عمر نے زبیر کو قائد جیش مقرر کرتے ہوئے سوال کیا تھا کہ کیا تم مصر کی گورنری لینا چاہتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا، میں حضرت عمرو بن عاص کا ساتھ دوں گا، ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔ جیش زبیر کے آنے سے حضرت عمرو کی فوج بڑھ کر ۱۵ ہزار ہوگئی تو انھیں یقین ہوا کہ مصر کی قسمت کا فیصلہ ہونے کی گھڑی آ گئی ہے۔ انھوں نے عین شمس (Heliopolis) کے ٹیلوں پر فوج کو ترتیب دیا۔ یہ جگہ بلند تھی، اس لیے اس کا دفاع کرنا آسان تھا۔ وافر پانی ہونے کی وجہ سے سبزے اور غلے کی بہتات تھی۔ حضرت عمرو کی خواہش تھی کہ رومی فوج قلعۂ بابلیون سے باہر نکل کر میدان میں مقابلہ کرے۔ یہ تمنا جلد پوری ہوئی، رومی سپہ سالار تھیوڈر نے اپنے جرنیلوں سے مشورہ کے بعد قلعے سے باہر آنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت عمرو نے یہ خبر سن کر راتوں رات ۵۰۰ سپاہی پہاڑ کے پیچھے بنو وائل کے غار میں چھپا دیے اور ۵۰۰ خارجہ بن حذافہ کی سربراہی میں ام دنین بھیج دیے۔ صبح سویرے وہ عین شمس کے ٹیلوں سے اتر کر کھلے میدان میں آ گئے۔ رومی فوج بھی پوری تیاری کے ساتھ باہر نکلی اور لڑائی شروع ہوئی۔ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ بنو وائل کے غار میں چھپا ہوا رسالہ باہر نکلا اور رومی فوج کے پچھلے دستوں پر ٹوٹ پڑا۔ رومیوں کی صفیں منتشر ہوگئیں اور انھوں نے گھبرا کر بائیں جانب ام دنین کا رخ کیا۔ عین اسی وقت ام دنین میں چھپے ہوئے مسلم سوار نکل آئے اور ان پر تلواریں آزمانا شروع کر دیں۔ رومیوں کو ایسے لگا، جیسے ان پر تین لشکر حملہ آور ہو گئے ہیں۔ اسی گھبراہٹ میں ان میں سے اکثر مارے گئے، باقی فرار ہو کر قلعے میں جا چھپے، کچھ کشتیوں میں بیٹھ کر نیل میں جا گھسے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد اسلامی فوج نے ام دنین پر دوبارہ حملہ کیا اور وہاں چھپے ہوئے رومیوں کو نکال باہر کیا۔ عین شمس کے فیصلہ کن معرکے کے بعد حضرت عمرو بن عاص نے قدیم شہر مصر پر بغیر کشت وخون کیے قبضہ کر لیا۔ فیوم میں موجود رومی نقیوس کی طرف بھاگ گئے تھے، اس لیے حضرت عمرو دریاے نیل پار کر کے صحرا میں پہنچے اور فیوم کو اپنے کنٹرول میں لیا۔ انھوں نے جنوبی ڈیلٹا میں بھی فوج بھیجی اور اثریب اور منوف پر قبضہ کیا۔ جو رومی اہل کار قابو آئے، انھیں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ باقی بچ جانے والوں پر اس قدر خوف طاری ہوا کہ وہ ٹولیوں کی صورت میں اسکندریہ کوچ کر گئے۔

کثیر تعداد میں رومی سپاہ بابلیون کے قلعے میں پناہ لیے ہوئی تھی، ان میں شاہ مصر مقوقس بھی تھا۔ دریاے نیل کے

کنارے پر واقع اس قلعے کے بڑے گیٹ تک بحری جہازوں کی آمد و رفت ممکن تھی۔ قلعے کے اندر پانی کے کنویں اور غلے کے کھیت کثرت سے تھے۔اس کے چاروں اطراف ایک گہری خندق کھدی ہوئی تھی جسے ایک متحرک پل کے ذریعے عبور کیا جاتا تھا۔اہل قلعہ اس پل کی حرکت کنٹرول کرتے تھے۔ادھر دریاے نیل میں پانی چڑھ آیا، یہ وہ طغیانی تھی جو اس دریا میں ہر سال آتی تھی۔ان حالات میں حضرت عمرو بن عاص نے قلعۂ بابلیون (Babylon Fortess) کا محاصرہ کیا۔رومی فوج منجنیقوں سے حملہ کرتی تو مسلمان پتھروں اور تیروں سے جواب دیتے۔ایک ماہ گزر گیا،مسلمانوں کے حوصلے میں کوئی کمی نہ آئی۔شاہ مقوقس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ ابھی نیل کا پانی اترنے میں قریباً ایک مہینا اور لگے گا تب کہیں نقیوس یا اسکندریہ سے کمک آسکے گی، کیوں نہ ان عرب بدوؤں کو مال و دولت کا لالچ دے کر رخصت کر دیا جائے۔اس نے اس سفارت کاری کو سالار بابلیون اعیرج (جارج) سے خفیہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔رات گئے مقوقس اور اس کے خاص درباری کشتی پر بیٹھ کر قلعے سے جزیرۂ روضہ چلے گئے اور وہاں سے حضرت عمرو بن عاص کو خط لکھا۔

مطالعۂ مزید: البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)،الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)،الفاروق عمر (محمد حسین ہیکل)، Conquest of Egypt Muslim (Wikipedia)۔

[باقی]

جاوید احمد غامدی

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ میں نے اِس دین کو جس طرح سمجھا ہے، اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ اِسی کتاب کا خلاصہ ہے جس میں کتاب کا نفس مضمون اُس کے علمی مباحث اور اُن کے استدلالات سے الگ کر کے سادہ طریقے پر پیش کر دیا گیا ہے۔

— جاوید

قانون سیاست

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے، اُس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ وہ تمدن کو چاہتا ہے اور پھر اِس تمدن کو اپنے ارادہ و اختیار کے سوءِ استعمال سے بچانے کے لیے جلد یا بدیر اپنے اندر ایک نظم اجتماعی پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسانی تاریخ میں سیاست و حکومت، انسان کی اِس خواہش اور اِس مجبوری ہی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے اور انسان جب تک انسان ہے، وہ اگر چاہے بھی تو اِس سے نجات حاصل کر لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، لہٰذا عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اِس دنیا میں حکومت کے بغیر کسی معاشرے اور تمدن کا خواب دیکھنے کے بجاے وہ اپنے لیے ایک ایسا معاہدۂ عمرانی وجود میں لانے کی کوشش کرے جو نظم اجتماعی کا تزکیہ کر کے اُس کے لیے ایک صالح حکومت کی بنیاد فراہم کر سکے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ انسان کی فطرت نے اُسے بالعموم یہی راہ دکھائی اور اِسی راستے پر جد و جہد کے لیے آمادہ کیا ہے، لیکن اِس کے جو نتائج اب تک نکلے ہیں اور جنھیں ہر شخص بچشم سر اِس عالم میں دیکھ سکتا ہے، تنہا وہی اِس حقیقت کو بالکل آخری حد تک ثابت کر دینے کے لیے کافی ہیں کہ زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح عقل انسانی اِس معاملے میں بھی آسمانی ہدایت کے بغیر بعض بنیادی نوعیت کے فیصلے پوری قطعیت کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ

نے اِسی بنا پر سیاست کا ایک قانون مسلمانوں کو دیا ہے۔ یہ درج ذیل پانچ دفعات پر مبنی ہے:

۱۔ اللہ و رسول نے جن معاملات میں کوئی حکم ہمیشہ کے لیے دے دیا ہے، اُن میں مسلمانوں کے اولی الامر کو، خواہ وہ ریاست کے سربراہ ہوں یا پارلیمان کے ارکان، اب اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان اپنی ریاست میں کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ہو یا جس میں اُن کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ اِس کے تحت، البتہ وہ پابند ہیں کہ اولی الامر کی طرف سے جو حکم بھی دیا جائے، اُسے پوری توجہ سے سنیں اور مانیں۔

۲۔ اِس اصول کی بنیاد پر جو نظم اجتماعی قائم ہو گا، اُس کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ قوم کی امانتیں اہلیت کی بنیاد پر لوگوں کے سپرد کرے اور عدل و انصاف کو زندگی کے ہر شعبے میں اور اُس کی آخری صورت میں قائم کر دینے کی جدوجہد کرتا رہے۔

۳۔ نماز قائم کی جائے، زکوٰۃ ادا کی جائے، بھلائی کی تلقین کی جائے اور برائی سے روکا جائے، یہ نظم اجتماعی کے دینی فرائض ہیں۔ اِنھیں پورا کرنے کے لیے جو ہدایات قرآن و سنت میں دی گئی ہیں، اُن کی رو سے:

ا۔ ریاست کے مسلمان شہریوں سے تقاضا کیا جائے گا کہ اپنے ایمان و اسلام کی شہادت کے طور پر نماز قائم کریں۔

ب۔ نماز جمعہ کا خطاب اور اُس کی امامت ریاست کے صدر مقام کی مرکزی جامع مسجد میں سربراہ مملکت، صوبوں میں گورنر اور مختلف انتظامی وحدتوں میں اُن کے عمال کریں گے۔

ج۔ ہر وہ مسلمان جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، اپنے مال، مواشی اور پیداوار میں مقررہ حصہ اپنے سرمائے سے الگ کر کے لازماً حکومت کے حوالے کر دے گا اور حکومت دوسرے مصارف کے ساتھ اُس سے اپنے حاجت مند شہریوں کی ضرورتیں، اُن کی فریاد سے پہلے، اُن کے دروازے پر پہنچ کر پوری کرنے کی کوشش کرے گی۔

د۔ بھلائی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے کے لیے ریاست کی طرف سے کچھ لوگ باقاعدہ مقرر کیے جائیں گے جو اپنے لیے متعین کردہ حدود کے مطابق اس کام کو انجام دینے کے لیے ہمہ وقت سرگرم عمل ہوں گے۔

۴۔ ریاست کے مسلمان شہری اگر نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں تو وہ تمام حقوق اُنھیں حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے اُن کی ریاست میں اُنھیں حاصل ہونے چاہییں۔ وہ آپس میں بھائی بھائی ہوں گے، قانونی حقوق کے لحاظ سے برابر ہوں گے، دین کے ایجابی تقاضوں میں سے نماز اور زکوٰۃ کے سوا کوئی چیز

قانون کی طاقت سے اُن پر نافذ نہیں کی جائے گی اور نہ ریاست اُن کی جان، مال، آبرو اور عقل ورائے کے خلاف کسی نوعیت کی کوئی تعدی کر سکے گی۔

۵۔ ریاست کے امرا و حکام کا انتخاب اور حکومت و امارت کا انعقاد لوگوں کی رائے اور مشورے سے ہوگا اور امارت کا منصب سنبھال لینے کے بعد بھی وہ یہ اختیار نہیں رکھیں گے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی رائے کو رد کر دیں۔

محمد رفیع مفتی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

صرف قرآن ہی دین کا ماخذ کیوں نہیں؟

سوال: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ایک کامل کتاب قرار دیا ہے اور اس میں ہر چیز کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے، جیسا کہ بعض علما مختلف آیات کے حوالے سے یہ بیان کرتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر قرآن مجید کے ساتھ کسی اور چیز کو دین کا ماخذ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ (محمد علی سجاد خان)

جواب: قرآن مجید کی جن آیات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اس کتاب میں کوئی کمی نہیں ہے اور اس میں ہر چیز کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے، ان کا مطالعہ کرنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان میں دین وشریعت کے اجزا زیر بحث ہی نہیں ہیں، بلکہ ان میں یہ بات کسی اور پہلو سے کہی گئی ہے، یہ آیات درج ذیل ہیں۔

ارشادِ باری ہے:

۱۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ۔ (الانعام ۶: ۳۸)

''ہم نے اپنی کتاب میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔''

اس آیت کا مطلب ہے کہ:

''...جس طرح یہ کائنات ان نشانیوں سے مملو (بھری ہوئی) ہے جو پیغمبر کی دعوت کی حقانیت کی شاہد ہیں، اسی طرح ہم نے قرآن میں بھی اپنے دلائل و براہین بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ایک ایک دعوے کو ایسے ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت کیا ہے اور اتنے مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے حجت قائم کی ہے کہ صرف عقل و دل کے اندھے اور بہرے ہی ان کے سمجھنے سے قاصر رہ سکتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/۴۹)

۲۔ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ، مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. (یوسف۱۲:۱۱۱)

''ان کی سرگزشتوں میں اہل عقل کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے۔ یہ کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں، بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔''

امین احسن اصلاحی اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''یعنی پچھلے انبیا اور ان کی قوموں کی سرگزشتوں میں اہل عقل کے لیے بڑا سامان عبرت موجود ہے۔ بشرطیکہ یہ عقل سے کام لیں اور ان سرگزشتوں کو صرف دوسروں کی حکایت سمجھ کر نہ سنیں، بلکہ ان سے خود اپنی زندگی کو درست کرنے کے لیے سبق حاصل کریں۔ یہ قرآن کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے، بلکہ جو پیشین گوئیاں اور جو حقائق آسمانی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں، یہ ان کی تصدیق، ہر متعلق چیز کی تفصیل، آغاز کے اعتبار سے رہنمائی اور انجام کے اعتبار سے رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔'' (تدبر قرآن ۴/۲۶۰)

۳۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ. (النحل۱۶:۸۹)

''اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے اور وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرماں برداروں کے لیے۔''

امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

''...یہ اس چیز (قرآن مجید) کا حوالہ ہے جو اس دنیا میں حق کی گواہی اور لوگوں پر اتمام حجت کا ذریعہ ہے۔ فرمایا کہ تمھارے اس فرض منصبی کے تقاضے سے ہم نے تم پر کتاب اتار دی ہے جو شہادت حق کے لیے تمام پہلوؤں سے جامع اور مکمل اور (شہادت حق سے) ہر متعلق چیز کو اچھی طرح واضح کر دینے والی ہے تاکہ کسی کے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔'' (تدبر قرآن ۴/۴۳۸)

٤ ۔ وَ کُلَّ شَیۡءٍ فَصَّلۡنٰہُ تَفۡصِیۡلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۱۲)

''اور ہم نے ہر چیز کی پوری پوری تفصیل کر دی ہے۔''

امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

''...یعنی آفاق کی ان نشانیوں کے علاوہ ہم نے تم پر یہ احسان بھی کیا ہے کہ اپنی اس کتاب میں بھی ہر ضروری چیز کی تفصیل کر دی ہے تاکہ غور کرنے والے کے اطمینان کے لیے یہ کتاب ہی کافی ہو جائے۔''

(تدبر قرآن ۴/۴۸۷)

درج بالا آیات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز کے موجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو دعوت دی گئی ہے اور حق کی شہادت کے حوالے سے جو استدلال کیا گیا ہے، اس میں کوئی کمی نہیں ہے اور وہ ہر پہلو سے جامع ہے۔ چنانچہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ کتاب اجزاے دین کے بیان اور ان کی تفصیلات کے پہلو سے مکمل ہے۔ اجزاے دین کے حوالے سے کئی چیزوں کو اس میں بیان ہی نہیں کیا گیا، مثلاً نماز کی رکعتیں، اوقات اور دیگر تفصیلات، زکوٰۃ کی شرحیں، مونچھیں پست رکھنا، عید الفطر اور عید الاضحیٰ وغیرہ۔ شریعت سے متعلق یہ اہم چیزیں قرآن مجید میں موجود ہی نہیں۔

چنانچہ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید اس پہلو سے جامع ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے دین کے سب اجزا بیان کر دیے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنا دین ایک رسول کے ذریعے سے دیا ہے اور یہ بات ایک تاریخی سچائی ہے کہ اس رسول نے خدا کا یہ دین ہمیں علم کی صورت میں بھی دیا ہے اور عمل کی صورت میں بھی۔ جو دین ہمیں علم کی صورت میں ملا ہے، وہ سارے کا سارا قرآنِ مجید میں ہے اور جو عمل کی صورت میں ملا ہے، وہ وہ سنت ہے، جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں جاری کیا ہے۔

چنانچہ اگر ہم قرآن کے علاوہ سنت کے اس ذریعے کا انکار کرتے ہیں تو پھر ان سب اعمال کو ہم بطور دین قبول ہی نہیں کر سکتے۔ بے شک ان میں سے بعض چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے، لیکن اس میں وہ ذکر اس طرح سے ہے کہ گویا یہ پہلے سے موجود اور متعارف چیزیں ہیں، جن پر لوگ عمل کر رہے ہیں اور قرآن محض کسی خاص پہلو سے ان کا ذکر کر رہا ہے۔ جب یہ حقیقت ہے تو پھر پورا دین حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن اور سنت دونوں کی طرف رجوع کریں۔

مذاہب سے گریز کی وجہ

سوال: دنیا کے سبھی مذاہب کے لوگ اپنے اپنے ادیان سے گریزاں کیوں ہیں؟

(محمد علی سجاد خان)

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مادیت پرستی کا دور ہے اور اس میں مابعدالطبعیاتی تصورات قطع نظر اس سے کہ وہ مبنی بر دلیل ہوں یا مبنی بر وہم، بہرحال انسانی سوچ کے دائرے کی چیز نہیں رہتے۔ چنانچہ انسان مذہب سے اور مذہبی رسوم ورواج سے گریزاں ہو جاتا ہے۔

خواتین کا قبرستان میں جانا

سوال: کیا کوئی خاتون فاتحہ پڑھنے کے لیے اپنے طہر کے زمانے میں قبرستان میں جاسکتی ہے؟

(فاروق عالم صدیقی)

جواب: عورت طہر اور حیض دونوں زمانوں میں قبرستان میں جاسکتی ہے۔ قبرستان کا معاملہ مسجد کی طرح کا نہیں ہے۔ وہ کسی قبر پر کھڑے ہو کر دعاے مغفرت بھی کرسکتی ہے۔

فاتحہ پڑھنے کا عمل سنت سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ دعاے مغفرت کرنا بالکل درست ہے۔

قبرستان کے گرد دیوار کی تعمیر

سوال: کیا قبرستان کے اردگرد دیوار تعمیر کی جاسکتی ہے؟ (فاروق عالم صدیقی)

جواب: اگر کسی جگہ اس حد بندی کی ضرورت ہو تو بالکل ایسا کیا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری

سوال: اگر بیوی نشوز اختیار کرتی ہے اور خاوند کی جان کی دشمن بن جاتی ہے تو کیا اس صورت میں بھی بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری مرد پر ہوگی؟ (تلاوت شاہ)

جواب: جب تک نشوز اختیار کرنے والی عورت، بیوی کی حیثیت سے مرد پر انحصار کرتی ہے اور مرد نے اسے اپنے سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ نہیں کیا، اس وقت تک وہ اس کے نان نفقے کا ذمہ دار ہے۔

رسول کا خدا کی عدالت ہونا

سوال: کسی قوم میں رسول کے عدالت بن کر آنے کا صحیح مطلب کیا ہے؟ مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بعض جگہ یہ کہتے ہیں کہ کسی رسول کا قتل ہونا ثابت نہیں اور بعض جگہ یہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے رسولوں کی تکذیب اور قتل کے جرائم کیے تھے۔ یہ متضاد بیان ذہن کو اس معاملے میں الجھا دیتا ہے۔ یہ الجھن ان کی تفسیر میں موجود درج ذیل مقامات پر پیش آتی ہے:

۱۔ ''...رسولوں کی اس امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے دشمنوں کو یہ مہلت نہیں دیتا کہ وہ ان کو قتل کر دیں۔ چنانچہ رسولوں میں سے کسی کا قتل ہونا ثابت نہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/۱۰۶)

۲۔ ''...اللہ نے یکے بعد دیگرے اپنے بہت سے رسول اور نبی بھیجے، اس عہد کو انھوں نے توڑ دیا اور جو رسول اس کی تجدید اور یاددہانی کے لیے آئے، ان کی باتوں کو اپنی خواہشات کے خلاف پا کر یا تو ان کی تکذیب کر دی یا ان کو قتل کر دیا۔'' (تدبر قرآن ۲/۵۶۶)

۳۔ ''...بنی اسرائیل نے رسولوں کی تکذیب اور ان کے قتل کے جو جرائم کیے، ان پر ان کی فوری پکڑ نہیں ہوئی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب کوئی پکڑ ہوگی ہی نہیں، حالاں کہ اللہ کی سنت یہ نہیں کہ وہ لازماً ہر جرم کی سزا فوراً ہی دے، بلکہ وہ مجرموں کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ توبہ واصلاح کر لیں اگر چاہیں۔''

(تدبر قرآن ۲/۵۶۶) (افتخار احمد)

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ خود قرآن مجید ہی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس میں نبی اور رسول کے الفاظ

الگ الگ معنوں میں آئے ہیں۔ درج ذیل آیت اس پر نصِ قاطع ہے:

ارشاد باری ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِيٍّ ....(الحج ۲۲:۵۲)

''اورنہیں بھیجا ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی...''

اس آیت میں ''نبی'' اور ''رسول'' کے الگ الگ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ رسول الگ ہے اور نبی الگ ہے، تبھی تو دونوں کا الگ الگ ذکر کیا جا رہا ہے۔

''رسول'' اور ''نبی'' کے الفاظ جب اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں تو اس وقت ان کا کیا مفہوم ہوتا ہے اور رسول کے خدا کی عدالت ہونے کا کیا مطلب ہے، اسے واضح کرتے ہوئے غامدی صاحب اپنی کتاب ''دین حق'' میں ص ۱۲-۱۳ پر لکھتے ہیں:

''قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان (پیغمبروں) میں سے بعض ''نبوت'' کے ساتھ ''رسالت'' کے منصب پر بھی فائز ہوئے تھے۔

''نبوت'' یہ ہے کہ بنی آدم میں سے کوئی شخص آسمان سے وحی پا کر لوگوں کو حق بتائے اور اس کے ماننے والوں کو قیامت میں اچھے انجام کی خوش خبری دے اور نہ ماننے والوں کو برے انجام سے خبردار کرے۔ قرآن اپنی اصطلاح میں اسے ''انذار'' اور ''بشارت'' سے تعبیر کرتا ہے:

''لوگ ایک ہی امت تھے۔ (اُنھوں نے اختلاف کیا) تو اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے۔'' (البقرہ ۲:۲۱۳)

''رسالت'' یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کوئی شخص اپنی قوم کے لیے اس طرح خدا کی عدالت بن کر آئے کہ اس کی قوم اگر اسے جھٹلا دے تو اس کے بارے میں خدا کا فیصلہ اسی دنیا میں اس پر نافذ کر کے وہ حق کا غلبہ عملاً اس پر قائم کر دے:

''اور ان کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تمھیں اِس سرزمین سے نکال دیں گے یا تم ہماری ملت میں واپس آؤ گے۔ تب ان کے پروردگار نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو لازماً ہلاک کریں گے اور ان کے بعد تمھیں لازماً اس سرزمین میں بسائیں گے۔'' (ابراہیم ۱۴:۱۳-۱۴)

''بے شک، وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں، وہی ذلیل ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔ بے شک، اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔''

(المجادلہ ۵۸:۲۰-۲۱)

رسالت کا یہی قانون ہے جس کے مطابق خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا کہ اسے وہ (سرزمین عرب کے) تمام ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ یہ بات (عرب کے) اِن مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار ہو۔'' (الصّف ۶۱:۹)

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ ان کے ذریعے سے اسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ انھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اس کی جزا اور اس سے انحراف کریں گے تو اس کی سزا انھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا ان کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ انھیں حکم دیا جاتا ہے کہ حق کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بے کم وکاست اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ ''شہادت'' ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور ان کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔''

دوسری بات یہ ہے کہ خود قرآن مجید ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ''نبی'' اور ''رسول'' کے الفاظ اپنے اصطلاحی معنوں سے ہٹ کر محض خدا کا فرستادہ، ایلچی اور پیغمبر کے معنوں میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ درج ذیل آیات اس پر نص قاطع ہیں:

''میں تیرے رب ہی کا پیغام بر ہوں تاکہ تمھیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔'' (مریم ۱۹:۱۹)

اور

''یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، ان کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔'' (البقرۃ ۲:۲۸۵)

ان دونوں آیات میں ''رسول'' کا لفظ فرستادہ، ایلچی اور پیغمبر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ جب ''رسول'' یا ''نبی'' کا لفظ اپنے غیر اصطلاحی مفہوم میں آتا ہے تو پھر قرآن میں نبی کے لیے ''رسول'' اور رسول کے لیے ''نبی'' کا لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ رسولوں کے قتل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان کی قوم ان کی تکذیب کر کے ان پر غلبہ پا لے اور انھیں قتل کر دے۔

اب ہم ''تدبر قرآن'' کے درج ذیل ان تینوں اقتباسات کو دیکھتے ہیں، جن میں آپ نے تضاد محسوس کیا ہے:

۱۔ ’’...رسولوں کی اس امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے دشمنوں کو یہ مہلت نہیں دیتا کہ وہ ان کو قتل کر دیں۔ چنانچہ رسولوں میں سے کسی کا قتل ہونا ثابت نہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/۱۰۶)

۲۔ ’’...اللہ نے یکے بعد دیگرے اپنے بہت سے رسول اور نبی بھیجے، اس عہد کو انھوں نے توڑ دیا اور جو رسول اس کی تجدید اور یاددہانی کے لیے آئے، ان کی باتوں کو اپنی خواہشات کے خلاف پا کر یا تو ان کی تکذیب کر دی یا ان کو قتل کر دیا۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/۵۶۶)

۳۔ ’’...بنی اسرائیل نے رسولوں کی تکذیب اور ان کے قتل کے جو جرائم کیے، ان پر ان کی فوری پکڑ نہیں ہوئی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب کوئی پکڑ ہو گی ہی نہیں، حالانکہ اللہ کی سنت یہ نہیں کہ وہ لازماً ہر جرم کی سزا فوراً ہی دے، بلکہ وہ مجرموں کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ توبہ واصلاح کر لیں اگر چاہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/۵۶۶)

ان تینوں اقتباسات میں سے پہلے میں رسالت کے بارے میں قانون کے حوالے سے بات ہوئی ہے کہ وہ قوم جس میں رسول آتا ہے، وہ اگر اس کی تکذیب کر کے اسے قتل کرنا چاہے تو خدا انھیں اس کی مہلت نہیں دیتا۔

دوسرا اقتباس جس آیت کے تحت لکھا گیا ہے، اُس میں صرف ’’رسول‘‘ کا لفظ موجود ہے اور وہ بھی غیر اصطلاحی، یعنی ایلچی اور پیغمبر کے معنوں میں ہے۔ چنانچہ مولانا اصلاحی نے بھی اس آیت کے تحت ’’رسول‘‘ اور ’’نبی‘‘ کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال کیے ہیں، یعنی یہاں ’’رسول‘‘ کا لفظ اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں ہے۔

تیسرے اقتباس کا معاملہ بھی یہی ہے کہ یہاں ’’رسول‘‘ کا لفظ اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں ہے۔ چنانچہ اس میں موجود ’’رسولوں کی تکذیب اور ان کے قتل‘‘ کے الفاظ سے ان کی مراد بنی اسرائیل کے انبیا کی تکذیب اور ان کا قتل ہے، کیونکہ جس آیت کے تحت یہ شرح لکھی گئی ہے، اس میں ’’رسول‘‘ کا لفظ اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں، بلکہ خدا کے فرستادہ اور ایلچی کے معنی میں ہے۔ ہماری اس بات کی دلیل اس آیت ہی میں موجود ہے۔ ارشاد باری ہے:

’’جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر آیا جو ان کی خواہش کے خلاف ہوئی تو ایک گروہ کی انھوں نے تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔‘‘ (المائدہ ۵:۷۰)

اس آیت میں رسولوں کی تکذیب اور ان کے قتل کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی بات بنی اسرائیل کی خواہش کے خلاف ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ محض رسولوں ہی کا معاملہ نہیں ہوتا کہ ان کی بات انسان کی خواہش کے خلاف ہوتی ہے، بلکہ نبیوں کا معاملہ بھی یہی ہوتا ہے، چنانچہ ضروری ہے کہ آیت میں موجود ’’رسول‘‘ کے لفظ میں رسول اور نبی دونوں کو شامل سمجھا جائے۔

سنن کی تعداد

سوال: غامدی صاحب کے نزدیک سنت سے کیا مراد ہے اور یہ کون کون سی ہیں؟ (اے کے فریدی)

جواب: سنت دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ درج ذیل ہیں:

''عبادات

۱۔ نماز۔ ۲۔ زکوٰۃ اور صدقۂ فطر۔ ۳۔ روزہ واعتکاف۔ ۴۔ حج وعمرہ۔ ۵۔ قربانی اور ایام تشریق کی تکبیریں۔

معاشرت

۱۔ نکاح وطلاق اور ان کے متعلقات۔ ۲۔ حیض ونفاس میں زن وشو کے تعلق سے اجتناب۔

خور ونوش

۱۔ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت۔ ۲۔ اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔

رسوم و آداب

۱۔ اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ ۲۔ ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اس کا جواب۔ ۳۔ چھینک آنے پر 'الحمد للہ' اور اس کے جواب میں 'یرحمک اللہ'۔ ۴۔ نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت۔ ۵۔ مونچھیں پست رکھنا۔ ۶۔ زیر ناف کے بال کاٹنا۔ ۷۔ بغل کے بال صاف کرنا۔ ۸۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ ۹۔ لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ ۱۰۔ ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ ۱۱۔ استنجا۔ ۱۲۔ حیض ونفاس کے بعد غسل۔ ۱۳۔ غسل جنابت۔ ۱۴۔ میت کا غسل۔ ۱۵۔ تجہیز وتکفین۔ ۱۶۔ تدفین۔ ۱۷۔ عید الفطر۔ ۱۸۔ عید الاضحیٰ۔'' (اصول ومبادی ۱۰-۱۱)

پینشن پر زکوٰۃ

سوال: کیا پینشن پر بھی اسی طرح پیداوار کی زکوٰۃ عائد ہوگی جیسے تنخواہ پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے؟

(اے کے فریدی)

جواب: پینشن پر پیداوار کی زکوٰۃ عائد نہیں ہو گی، کیونکہ یہ رقم نہ اصلاً محنت سے حاصل ہوئی ہے، نہ اصلاً سرمایے سے اور نہ ان دونوں کے تعامل سے، بلکہ یہ سابقہ خدمات کے صلے میں دیا جانے والا ایک Benefit ہے۔ البتہ اگر کسی کے ہاں سال گزرنے کے بعد یہی پینشن حد نصاب تک پہنچ جاتی ہے، تو پھر اس پر ڈھائی فی صد کے حساب سے مال کی زکوٰۃ لگے گی۔

تحفظ حقوق نسواں بل

سوال: حکومت نے حال ہی میں ''تحفظ حقوق نسواں'' بل پاس کیا ہے۔ اس کے بارے میں بعض علما کا یہ کہنا ہے کہ اس بل کے نتیجے میں ملک میں جنسی آزادی جنم لے گی۔ اس میں آخر ایسی کیا غلطی ہے، جس کی بنا پر وہ ایسا کہہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس سے پہلے عورتوں کے حق میں قانون انصاف پر مبنی نہیں تھا اور اس سے انھیں تحفظ ملا ہے۔ (عاقب خلیل)

جواب: جن لوگوں نے ''تحفظ حقوق نسواں'' بل پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ جنسی آزادی کا باعث بنے گا، انھوں نے اس پر درج ذیل اعتراضات کیے ہیں۔

پہلا یہ کہ زنا بالجبر کی جو سزا قرآن وسنت نے بیان کی ہے اور جسے اصطلاح میں حد کہتے ہیں، اسے اس بل میں مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے، اس کی رو سے زنا بالجبر کے کسی مجرم کو کسی بھی حالت میں شرعی سزا نہیں دی جا سکتی، بلکہ اسے ہر حال میں تعزیری سزا دی جائے گی۔

دوسرا یہ کہ حدود آرڈی نینس میں جس جرم زنا کو موجب تعزیر کہا گیا تھا، اسے اس بل میں فحاشی (Lewdness) کا نام دے کر اس کی سزا کم کر دی گئی ہے اور اس کے ثبوت کو مشکل تر بنا دیا گیا ہے۔ ثبوت کو مشکل تر بنانے کی وضاحت یہ ہے کہ اب زنا کے حوالے سے پولیس کوئی اقدام ہی تب کرے گی جب اسے دو گواہ میسر ہوں گے۔ نیز اس بل کے مطابق سولہ سال سے کم عمر خاتون، خواہ وہ حقیقتاً بالغ ہی کیوں نہ ہو، اس کے ساتھ اگر اس کی رضامندی کے بغیر یا رضامندی کے ساتھ زنا کیا گیا ہے تو ہر دو صورتوں میں مرد کو زنا بالجبر کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور اس خاتون کو بری قرار دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس بل میں اور بھی بعض ایسے مسائل موجود ہیں جو جرم زنا کے خلاف قانون کو سست

اور کمزور بناتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس بل میں موجود یہ پہلو تشویش ناک ہیں۔

وجود باری کا اثبات

سوال: کسی دہریے کو ہم یہ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ خدا موجود ہے؟ (عاقب خلیل خان)

جواب: اصل سوال یہ نہیں کہ خدا کا وجود ثابت کیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ خدا کے وجود کا انکار کیسے ممکن ہے۔ انکار کرنے والوں کے ذہن میں عموماً اس کا جواب یہ آتا ہے کہ چونکہ وہ حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں آتا، اس لیے وہ موجود ہی نہیں ہو گا، لیکن ان کی یہ بات درست نہیں، کیونکہ ہم سیکڑوں چیزوں کو حواس خمسہ سے نہیں، بلکہ عقل سے مانتے ہیں۔ اسی طرح بے شمار چیزوں کو ہم وجدان کی بنا پر مانتے ہیں، نہ کہ حواس خمسہ سے۔

اصل بات یہ ہے کہ کیا ہم خدا کے تصور کے بغیر اپنا اور اس کائنات کا خیال بھی دل میں لا سکتے ہیں؛ کیا خدا کے تصور کے بغیر اس کائنات کی، انسان کی اور اس زندگی کی کوئی توجیہ ممکن ہے؟ اور کیا اس توجیہ کے بغیر اعلیٰ اخلاق پر قائم کوئی زندگی ممکن ہے؟ اگر کسی کے خیال میں ایسا ممکن ہے تو یہ ہے وہ چیز جس کے حق میں اسے دلائل دینے چاہییں اور اس کو ثابت کرنا چاہیے، کیونکہ اس کے نتیجے میں خدا کی نفی ہو جائے گی۔

خدا ابدہ البدیہات ہے، اس کے بارے میں ثبوت اور دلائل کی ضرورت نہیں، وہ ثابت ہے۔ جو اس کی نفی کرنا چاہتا ہے، اس کے ذمے ہے کہ وہ اس کی نفی کے دلائل دے۔

سورۂ نساء کی آیت ۶۹ کا مفہوم

سوال: سورۂ نساء کی آیت ۶۹ کا کیا مطلب ہے؟ (عرفان)

جواب: سورہ نساء کی آیت ۶۹ درج ذیل ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ

وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيۡقًا. (النساء۴:۶۹)

''اور جو اللہ اور (اس کے) رسول کی اطاعت کریں گے وہی ہیں جو انبیا، صدیقین اور شہدا اور صالحین کے اس گروہ کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا فضل فرمایا ہے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔''

اس سے پچھلی آیات میں منافقین کو یہ توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اگر وہ بھی اپنے خاندان، قبیلے اور گھر در کی وابستگیوں سے آزاد ہو کر پوری یک سوئی سے مسلمانوں کے معاشرے میں شامل ہو جائیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور اسلام پر ان کے قدم جمانے میں یہ چیز نہایت کارگر ثابت ہو گی۔ پھر اس آیت میں اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا کہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ یہ کوئی تباہی اور خودکشی کا راستہ ہے، بلکہ اگر وہ اللہ کے لیے اپنے گھر در چھوڑیں گے تو اللہ ان کو خاص اپنے پاس سے اجر عظیم دے گا اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب کرے گا، جو لوگ سب سے کٹ کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ان کو (آخرت میں) اللہ تعالیٰ اپنے انعام یافتہ بندوں ـــــ انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین ـــــ کی معیت و رفاقت میسر کرے گا اور یہ رفاقت وہاں بہت بڑا انعام ہو گی۔

دنیا کا پہلا انسان

سوال: کیا آدم علیہ السلام دنیا کے پہلے انسان تھے یا انسان کی تخلیق ان سے پہلے ہو چکی تھی، انسان کی تخلیق کیسے ہوئی تھی؟ کیا آدم علیہ السلام ہی پہلے نبی ہیں یا نوح علیہ السلام پہلے نبی ہیں۔ نیز فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے کا واقعہ کیا کوئی حقیقی واقعہ ہے یا یہ قرآن کا ایک انداز تمثیل ہے؟ (آصف بن خلیل و قمر اقبال)

جواب: یقیناً آدم علیہ السلام ہی دنیا کے پہلے انسان تھے۔

ارشاد باری ہے:

خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنَ. (آل عمران۳:۵۹)

''خدا نے اس (آدم) کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ تو ہو جا تو وہ ہو گیا۔''

یعنی آدم کے ماں باپ نہ تھے۔ رہا یہ سوال کہ اللہ نے آدم کو مٹی سے کیسے بنایا، تو یہ اُن امور میں سے ہے، جن کا اللہ نے ہمیں مشاہدہ نہیں کرایا۔ لہٰذا، ہم یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ بس جتنے الفاظ قرآن میں آئے ہیں،

انھی کو بیان کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ وہ مٹی جس سے آدم کو بنایا گیا تھا، وہ پہلے گارا تھی پھر سوکھ کر کھنکھنانے لگی، پھر ایک مرحلے پر اس میں روح پھونکنے کا عمل ہوا تھا۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس عمل کی حقیقت کیا تھی۔

یقیناً آدم علیہ السلام ہی پہلے نبی تھے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ. (آل عمران ۳:۳۳)

''بے شک اللہ نے منتخب فرمایا (نبوت کے لیے) آدم، نوح اور آل ابراہیم کو۔''

اس آیت میں آدم علیہ السلام کی نبوت کا ذکر ہے۔

فرشتوں کے سجدہ کرنے کا واقعہ تمثیلی نہیں، بلکہ حقیقی ہے۔ اس کا حکم اللہ نے تخلیق آدم سے پہلے ہی فرشتوں کو دے دیا تھا۔ ارشاد باری ہے:

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰۤئِكَةِ اِنِّىۡ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ. (الحجر ۱۵:۲۸-۲۹)

''اور یاد کرو جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اس کو مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک لوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو تخلیق آدم سے پہلے ہی سجدے کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ یہ بات تمثیلی نہیں ہو سکتی۔
